پہنچ سکتی، گووند سہائے صاحب کی یہ ہمت اور دیانت قابلِ تعریف ہے،

سفینہ از جناب سہیل مالیگانوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۸۴ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی

قیمت ۱ - عہ پتہ قصر الادب مالیگانوں ناسک،

مصنف اردو کے روشناس شاعر ہیں، سفینہ ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے، اردو شاعری میں خیالات اور بحر و وزن کے اعتبار سے سب سے زیادہ مشکل صنف رباعی ہے، اور اس کے لئے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہے، مصنف نے حتی الامکان ان دشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے، اور بعض رباعیاں ان کے قلم سے ایسی نکل گئی ہیں جو دماغ کو متوجہ کر لیتی ہیں، باقی فروگذاشتوں کے متعلق انھوں نے یہ تصریح کر دی ہے کہ اوزان کی پابندی جہانتک ممکن نظر آئی کی اور کہیں کہیں آزادی بھی اختیار کر لی ہے، تنقید کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا، قوافی میں ایطا کی قید سے الگ ہوں، اس معذرت کے بعد کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں، یہ معذرت مصنف کے قلم سے ان رباعیات پر خود اچھی تنقید ہے،

ارتقاء مرتبہ جناب سرشار صدیقی تقطیع اوسط ضخامت ۴۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر،

قیمت تحریر نہیں، پتہ ۱ - مکتبہ توسیع الادب اردو منزل احاطہ کمان خان، کانپور،

کانپور اگرچہ ایک تجارتی شہر ہے لیکن اسکی مرکزیت لکھنؤ کے قرب اور اسکے ساتھ علمی وادبی تعلقات کی بنا پر یہاں ہمیشہ شعر و ادب کا مذاق رہا اور ادبی مجالس بھی قائم ہوتی رہیں، توسیع الادب بھی اسی قسم کا ادارہ ہے، ارتقاء کے نام سے اس نے موجودہ دور کے کانپوری یا کانپور سے تعلق رکھنے والے شعراء کے کلام کا نمونہ شائع کیا ہے، اور رئیس المتغزلین حسرت موہانی، حافظ محمد صدیق، ثاقب کانپوری، نسیم ناطقی، شارق ایرانی کا کلام ہی اور وفا شاہجہانپوری، ندرت کانپوری، اعیان حیدری، کوثر عابدی اور انور کانپوری کی ایک ایک غزل اور نشور واحدی، سالک کانپوری کی نظم اور فرحت کانپوری کی رباعیات دی ہیں، نثر میں پرنسپل عبد الشکور صاحب اور پروفیسر اویس احمد صاحب ادیب کے مضامین کے نمونے دیئے ہیں لیکن وہ اتنے مختصر ہیں کہ ان پر مضمون کا اطلاق بھی مشکل ہے، اس مجموعہ کو نام کو بھی کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی اور نام دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید مسئلہ ارتقاء پر بحث ہوگی،

"م"

جلد ۶۳ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۴۹ء عدد ۳

مضامین

———

اُردو اور ہندی کے مسئلہ مین ہم بارہا اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہین، آج اس سلسلہ مین اردو کے حامیون سے کچھ کہنا ہے، اُن کو اردو کے ساتھ حکومت کے طرز عمل کی شکایت بالکل بجا ہے لیکن اگر ان سے سوال کیا جائے کہ خود ان کا طرز عمل اُردو کے ساتھ کیا رہا ہے، اور انھون نے اس کی کیا خدمت کی تو ان کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہین ہے، ہمارے ایک طبقہ کی اُردو سے بے تعلقی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بچون کی اُردو کی تعلیم کی جانب بھی توجہ نہین کرتا، اونچے تعلیم یافتہ گھرانون مین تو بسم اللہ ہی انگریزی سے کرائی جاتی ہے، تقریر و تحریر خط و کتابت اور گھر سے باہر اکثر و بیشتر گفتگو بھی انگریزی یا ایسی زبان مین ہوتی ہے جس مین پچاس فیصدی سے زیادہ الفاظ انگریزی کے ہوتے ہین، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو محض مادری زبان کی حیثیت سے تو بولنا آجاتی ہے، لیکن بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص صاف اور سلیس اُردو نہین لکھ سکتے، اُن کو خط لکھنے مین دشواری ہوتی ہے، اور املا تک مین غلطیان کرتے ہین، اس کا مشاہدہ مغرب زدہ گھرانون مین کیا جا سکتا ہے، اور یہ پرانی داستان نہین ہے، بلکہ آج بھی یہی ہو رہا ہے،

یہ طبقہ اُردو کے اخبارات، رسالون اور کتابون کا مطالعہ کسر شان سمجھتا ہے، اور یہ عذر کیا جاتا ہے کہ ان کا معیار پست ہے، اخبارون اور رسالون کی حد تک تو یہ خیال صحیح ہو مگر اس مین بھی قصور کس کا ہے، ترقی اسی چیز مین ہوگی جس کی مانگ ہوگی، ہماری قدردانی کا یہ حال ہے کہ اچھے سے اچھے اُردو اخبارات کی اشاعت دو چار ہزار سے زیادہ نہین ہے، رسالون کی اشاعت تو اس سے بھی کم ہے، ان کی آمدنی سے ان کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہین، ایسی حالت مین ان کی ترقی کی کیا صورت ہو، اگر آج ان کی مانگ اور اشاعت بڑھ جائے تو اُن کا معیار بھی اونچا ہو جائے گا، لیکن اُردو کی کتابون کی نسبت معیار کی پستی کا خیال صحیح نہین، گو ان کا معیار ترقی یافتہ زبانون کی تصانیف کے برابر نہین ہے، لیکن اب اُردو مین ضروری اور لائق مطالعہ فنون کی کتابون کا اچھا خاصہ ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے اور سنجیدہ لٹریچر مین ہندوستان کی کوئی زبان اُردو کا مقابلہ نہین کر سکتی، تاہم ابھی اس کو ترقی دینے کی ضرورت باقی ہے، لیکن اخبارات اور رسالون کی طرح اس کا بھی حال ہے ایک طبقہ کو ذوق تو ہے مگر ادنیٰ درجہ کے لٹریچر کا، سنجیدہ علمی ذوق نہایت محدود طبقہ مین ہے، ایسی حالت مین بلند پایہ کتابین کس کے لئے لکھی جائین،

اُردو کے اصحاب علم و قلم کی کمی نہین ہے لیکن ان کے پاس سرمایہ نہین ہے، وہی تصنیف کی دماغ سوزی اور جانکاہی بھی برداشت کرین، طبع و اشاعت کے مصارف کا بار بھی اٹھائین، اس پر بھی خریدار نہین ملتے اور کتابون کے ایک اڈیشن ختم ہونے مین ایک عمر لگ جاتی ہے، ایسی حالت مین کسی صاحب قلم کو کیا حوصلہ ہو سکتا ہے، اگر اُردو کتابون کے مطالعہ اور اُن کی خریداری کا ذوق بڑھ جائے تو چند دنون مین اُن کی کمیت اور کیفیت دونون مین نمایان ترقی ہو جائے گی،

آجکل اخبارات کو قومون کے بنانے اور بگاڑنے مین بڑا دخل ہے اور اُن کی ذہنی جلا اور دماغی روشنی کے لئے صالح اور مفید لٹریچر بڑی ضروری چیز ہے، چنانچہ ترقی یافتہ ملکون مین ان کی طرف بڑی توجہ کی جاتی ہے، ہم کو اس کا احساس تو ہے لیکن اس کے مطابق عمل نہین، ہم اپنے فائدہ اور صنعتی ترقی کے لئے ذاتی اور مشترکہ سرمایہ سے بڑے بڑے کارخانے اور فرم کھولتے ہین، لیکن قوم کی ذہنی و دماغی تربیت و ترقی کے لئے اعلیٰ درجہ کے اخبارات نہین نکالتے اور بلند تالیف و تصنیف کے علمی ادارے قائم نہین کرتے، جو صنعتی کارخانون سے زیادہ ضروری ہین، اور ملک مین اس قسم کے جو ادارے قائم بھی ہین اُن کی جانب پوری توجہ نہین کرتے، حالانکہ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی ان میں سرمایہ لگانا مفید ہے،

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اُردو محض زبانی شور و غل سے زندہ نہین رہ سکتی اور نہ حکومت کی مخالفت سے ختم ہو سکتی ہے، اس کی بقا و ترقی اس کے حامیون کی کوشش پر منحصر ہے، وہ کروڑون ہندو مسلمانون کی زبان ہے، جو سیاسی بازیگر پلیٹ فارم پر اس کی مخالفت کرتے ہین وہ بھی روزانہ کی گفتگو مین اُردو ہی بولتے ہین، اگر اردو کے حامی اس کو ترقی دینے کا تہیہ کر لین اور اس کی عملی تدبیرین اختیار کرین تو کوئی طاقت اس کو دبا نہین سکتی، زبانین حکومت کے سہارے زندہ نہین رہتین، ترقی یافتہ ملکون مین بڑے بڑے اخبارات رسالے اور علمی و تصنیفی ادارے حکومت نہین بلکہ قوم چلاتی ہے، خود ہندوستان مین ہندی اخبارات، رسالون اور کتابون کی اشاعت مین حکومت کی مدد کو اب تک کوئی دخل نہین رہا ہے، اس کے باوجود بہت سے ہندی اخبارون اور رسالون کی اشاعت دس ہزار سے لے کر پچیس تیس ہزار تک ہے، بنگالی زبان کے ایک پرانے مشہور اخبار انند بازار پتر کا کی اشاعت جو صرف ایک صوبہ کی زبان ہے، پچاس ہزار تھی، یہی حال ہندی کتابون کی کثرت اشاعت کا ہے، ایسی حالت مین اردو اخبارون، رسالون اور کتابون کی اشاعت جس کے بولنے اور سمجھنے والے سب سے زیادہ ہین، کیون نہین بڑھ سکتی، اس کا سبب صرف ہماری بے توجہی ہے، اُردو

مین آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی قدرتی صلاحیت ہے اگر اس کی جانب تھوڑی سی توجہ بھی کی جائے تو ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہین کر سکتی، ورنہ اُردو سے محبت کا محض زبانی دعویٰ زیب نہین دیتا، اور نہ اس سے کچھ حاصل ہوگا، آیندہ کسی موقع پر ہم اس موضوع پر تفصیلی خیالات پیش کرین گے،

افسوس ہے کہ ہماری قومی عمارت کا ایک اور ستون گر گیا، اور ۲ مارچ کو مسز سروجنی نیڈو ہم سے رخصت ہو گئین، وہ عورت تھین مگر اپنے اوصاف اور خصوصیات مین بہتیرے مردون سے بڑھ کر تھین، وہ انگریزی زبان کی نازک خیال شاعرہ، سحر طراز خطیبہ، سیاسیات کی ماہر، جنگ آزادی کی سرفروش سپاہی اور ہندو مسلم اتحاد کا عملی نمونہ تھین، انھون نے آزادی کی جنگ مین مردون کے دوش بدوش قید و بند کی مصیبتین جھیلین، وہ فرقہ وارانہ جذبات سے بلند اور صلح کل تھین، ان کا دل بڑا وسیع تھا، اس مین مسلمانون کے لئے بھی جگہ تھی، مسلمانون کے ساتھ ہمیشہ اُن کے دوستانہ تعلقات رہے، اور اس فرقہ وارانہ دور مین بھی اُن کے خیالات اور طرز عمل مین کوئی تبدیلی نہین ہوئی تھی، ہندو مسلمانون کے بعض اختلافی مسائل مین اُن کے ذاتی خیالات حکومت کی پالیسی سے مختلف تھے، جن کو وہ صاف طریقہ سے ظاہر نہ کر سکتی تھین، لیکن اُن کی جھلک ان کی تقریرون مین نظر آجاتی تھی، وہ مغربی تعلیم یافتہ تھین، اُن کی ساری زندگی سیاسی میدان مین گذری، اس کے باوجود اُن مین نسوانی اور مشرقی خصوصیات موجود تھین، دل مین نسوانی مہر و محبت، طبیعت مین خلق و مروت، مزاج مین شگفتگی و خوش اخلاقی اور تہذیب و معاشرت مین مغربی آب و رنگ کے ساتھ مشرقی روح جھلکتی تھی، وہ اپنے طرز عمل سے ہندو مسلمان دونون مین مقبول تھین اور دونون کا اعتماد ان کو حاصل تھا، اس لئے ان کی موت دونون کا قومی حادثہ ہے، ہوا کا رُخ دیکھتے ہوئے اب ایسی شخصیتون کا پیدا ہونا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے،

دوسرا بڑا حادثہ مسٹر سید حسین کی وفات ہے، مرحوم ہندوستان کی تحریک آزادی کے دور اول کی یادگار، انگریزی زبان کے بہترین خطیب و انشا پرداز اور نامور صحافی تھے، عرصہ تک الہ آباد کے مشہور پرانے اخبار انڈیپنڈنٹ کے اڈیٹر رہے، پھر وفد خلافت مین لندن گئے اور غالباً وہین سے امریکہ چلے گئے اور پچیس تیس سال تک وہان اپنے قلم و زبان سے ہندوستان کی خدمت کرتے رہے اور امریکہ کے سیاسی اور صحافتی حلقون مین بڑا نام پیدا کیا، ہندوستان کی آزادی کے بعد وطن واپس آئے اور نومبر ۱۹۴۷ء مین حکومت ہند کی جانب سے مصر کے سفیر بنا کر بھیجے گئے، اور وہین گذشتہ فروری مین انتقال کیا، ہندو مسلمانون مین ایسے صاحب کمال مشکل سے پیدا ہون گے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اُن کی وفات پر ہندوستان کے اکابر کی خاموشی حیرت انگیز ہے،

مقالات

اردو زبان کی بناوٹ مین افغانون کا حصّہ

از

جناب مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی

نئے افغانی مورخون کا نظریہ یہ ہے کہ پرانے نوشتون کے مطابق افغانستان ایرین نسل کا پُرانا گھر ہے، اس ملک کو عہد قدیم مین "آریانا" یعنی ایرینون کا گہوارہ کہا جاتا تھا، اور یہین سے پل بڑھ کر یہ نسل مشرق و مغرب مین پھیلی ہے،

یہ خیال تاریخی معیار پر پورا اُترتا ہے یا نہین، اس سے سر دست سروکار نہین، تاہم یہ سب کی مانی ہوئی بات ہے کہ آریا نسل کی ہندوستان مین آمد اسی راستہ سے ہوتی رہی ہے، بنا برین یہ کہنا بیجا نہ ہوگا، کہ آریائی ہندوستان کا افغانستان سے رشتہ خود ہندوستان کے مقابلے مین بھی زیادہ پُرانا ہے،

افغانستان نے اپنے ان آریائی جگر گوشون کو پردیس بھیج کر اُن کی طرف سے کبھی غفلت نہین برتی، ہندوستان کو تاتاری اور ایرانی غارتگرون کی لوٹ کھسوٹ سے بچانے مین یہ چھوٹا سا ملک ہمیشہ سینہ سپر رہا ہے، اور جب تک اپنے خون کو پانی کی طرح نہین بہا دیا، بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی ادھر پھٹکنے نہ دیا،

لیکن ہندوستان کی اس بیہم امداد کا اُسے ہمیشہ یہ خمیازہ بھگتنا پڑا کہ کبھی ہندوستانی راجاؤن نے اُسے اپنے ملک کی بیرونی چوکی بنایا، اور جب اس پار کے بادشاہون کو موقع مل گیا، تو انھون نے ہندوستان

کے اندر بڑھنے کے لئے اس سے محفوظ اور مستحکم چھاؤنی کا کام کیا،

یہ سیاسی اُدھیڑبُن ہزارون برس تک جاری رہی تھی، اس لئے ماقبلِ اسلام تک ہندوستان اور شرقی افغانستان مین بہت گہرا مذہبی، معاشرتی اور لسانی رابطہ قائم رہا، بدھ مت کا تو زبردست قلعہ ہی یہ سرزمین تھی، یہین سے اس مذہب نے باہر قدم نکالا تھا، اگر افغانستان اس کا مددگار نہ ہوتا، تو ہندی برہمن کبھی کا اسے دفن کر چکے تھے،

اسلامی عہد مین بھی افغانون نے ہندوستان کو فراموش نہین کیا، اور جس عقیدے کو وہ دنیا کے لئے باعثِ نجات سمجھتے تھے، اُسے لے کر یہان آنا شروع ہوگئے، مگر اب انھین اسلامی اصول کی پرشوکت سادگی اور قوت نے ہندوستانیون پر بالادستی عطا کر دی تھی، جس کے باعث وہ قوتِ موثرہ کی حیثیت رکھتے تھے، اور ہندوستان اُن سے نیا مذہب، نئی تہذیب، نئے علوم اور نئی زبانین سیکھنے پر مجبور تھا،

افغانون کی یہ نئی آمد سلطان محمود غزنوی کے والد سبکتگین کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتی ہے، محمود کے زمانہ مین افغانون کا اثر تیزی کے ساتھ بڑھتا رہا، اور آخر کار اس خاندان نے ہندوستان کے شمال مغربی حصہ کو اپنے ممالکِ محروسہ مین شامل ہونے پر مجبور کر دیا، حاکم سات سمندر پار بیٹھ کر بھی محکومون پر اپنا اقتدار رکھتا ہے، لیکن دو آخری غزنوی بادشاہون نے ایرانی دباؤ سے غزنی چھوڑ کر لاہور کو مرکز بنایا، تو پنجاب میں افغانی اثر زیادہ نمایان ہوگیا،

چھٹی صدی ہجری (بارھوین صدی عیسوی) کے آخر مین غوریون نے غزنوی سلطنت پر قبضہ کیا، تو ہندوستان اور افغانستان کے رشتے مین اور استواری پیدا ہوگئی، سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی پر قبضہ کر کے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت مقرر کیا،

ایبک اور اس کے جانشینون نے رفتہ رفتہ ہندوستان کے طول و عرض مین اپنی حکومت کا پرچم لہرا دیا، اور دکن، مالوہ، خاندیس، گجرات، اودھ، بہار اور بنگال تک افغانی پھیل گئے،

نوین صدی ہجری (۱۵ وین عیسوی) کے وسط مین سلطان بہلول لودھی نے تختِ ہندوستان پر قبضہ کیا، تو افغانیون نے اپنے مضمحل قوائے سیاسی مین نئی روح پھونک لی، ملکی استحکام سے فارغ ہو کر اس خاندان نے خالص ہندیون سے مزید ارتباط اور مفاہمت سے نئی سبیل نکالی، سلطان سکندر لودھی نے جو اپنے خاندان ہی مین نہین، ہندوستان کے تمام مسلمان سلاطین مین جاہ و جلال اور عدل و داد کے لحاظ سے ممتاز درجہ رکھتا تھا، ہندوؤن کو فارسی زبان حاصل کرنے کی ترغیب دی، اور اس طرح ہزارون ہندو ملکی کاروبار مین برابر کے شریک کی حیثیت سے کام کرنے لگے،

اس خاندان کے آخری بادشاہ، سلطان ابراہیم لودھی سے تیموری مغل بابر نے تاج و تخت چھین کر سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد رکھی، تو ہندوستان مین افغانیون کا اتنا زبردست عنصر موجود تھا کہ بابر کے جانشین ہمایون کو اُن کے سامنے ٹھہرنا محال ہوگیا، اور شیر شاہ سوری کی سرکردگی مین پھر افغانی حاکم بن بیٹھے،

شیر شاہ کے بعد ہمایون نے ایرانیون کی مدد سے دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کر لیا، مگر اپنی نہایت جابرانہ پالیسی کے باوجود اکبر جیسا مغل بادشاہ نہ صرف یہ کہ افغانون کے اثر سے ملک کو پاک و صاف نہ کر سکا بلکہ مجبور ہوا کہ اسی آئین اور انہی اصول و ضوابط کے تحت حکومت کی مشین چلائے، جو پچھلے افغان بادشاہ اپنی خداداد عقل اور مدبرانہ تجربے سے مقرر کر چکے تھے، چنانچہ اکبر کا پٹھانون کے اثر کو توڑنے کے لئے راجپوتون سے رشتہ جوڑنا، سلطان سکندر لودھی کی اس پالیسی کی نقل تھی جس نے ہندوستان کے کایتھون کو یکسر برہمنون اور راجپوتون کو ایک حد تک اسلامی حکومت کا ہوا خواہ بنا دیا تھا، اور شیر شاہ کی نقالی تو اس حد تک کی گئی تھی کہ ملک داری کے وہ تمام آئین جو ابوالفضل نے آئینِ اکبری مین ظل اللہ کی ذات سے منسوب کئے ہین، محققین تاریخ کے نزدیک سراسر شیر شاہی فہم و دانش کا نتیجہ ہین، چنانچہ راجہ ٹوڈرمل جو دربارِ اکبری کے ایک بیش قیمت رتن ہین، شیر شاہ ہی کے کسی دفتر کے معمولی متصدی تھے،

یون تو مغل سلطنت کے روشن عہد مین بھی افغانیون نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو یکسر فنا ہونے سے بچائے ہی رکھا، لیکن عالمگیر کے بعد مغلیہ سلطنت مین زوال کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے، تو انھون نے پھر اپنا رسوخ ملک کے اندرونی حصون مین بڑھانا شروع کر دیا، لاکھون افغان ترکِ وطن کر کے ہندوستان مین آ داخل ہوئے، اور ابتداءً یہان کے ہندو مسلمان امراء کے نوکر بن کر اور آخر مین جگہ جگہ اپنی ریاستین قائم کر کے بیٹھ گئے، یہ ہجرت اتنی زبردست تھی کہ بقول کرنل راورٹی بعض افغانی قبیلے خود افغانستان مین باقی نہ رہے، اُن کا نام صرف ہندوستانی اخلاف کی بدولت زندہ ہے، ان نو وارد افغانون کا بڑا مرکز گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ تھا، جو تاریخ مین دوآبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہین سے ان بہادرون نے مرہٹون، سکھون، مغلون، اودھیون اور انگریزون کا مقابلہ شروع کیا، اور جون جون موقع ملتا گیا، مختلف سردار چھوٹی بڑی ریاستین قائم کرتے گئے، نجیب آباد، فرخ آباد اور آنولہ اس عہد کی بھولی بسری داستان کے روشن نام ہین،

یہ تازہ وارد افغانی عنصر عرصہ دراز تک آس پاس کی اُبھرتی قوتون کے پاؤن کا کانٹا بنا رہا، اور جب تک اس مین سکت باقی تھی، کسی کو بھی من مانی کاروائی کرنے کی اجازت نہ دی، لیکن بتیس دانتون مین گھری ہوئی ایک زبان کیا اور کب تک کچھ کر سکتی تھی، انگریزون نے یہ یقین کر رکھا تھا کہ ان کی راہِ ترقی مین یہی روہیلے سب سے زیادہ خطرناک روک ہین، انھون نے دوسرون سے سازشین کر کر کے آخر ان پر قابو پا لیا، اور یہ ترقی پذیر اور صالح عنصر ختم ہو گیا، مگر خود دار، دل اور دیدہ ور انگریز مدبر بھی اُن کی قوت کے تباہ ہونے پر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے، بھوپال، ٹونک، جاورہ اور ریاستِ عالیہ رامپور جیسی دو چار ریاستین جو آج ہندوستانی نقشے مین نظر آتی ہین، انہی افغانون کی سخت جانی کے چند نشان سمجھنا چاہیے،

افغانی تاجر تاریخ کے مختلف دورون مین ہندوستان کے اندر افغانیون کے سیاسی مد وجزر کی مذکورہ بالا داستان کے ساتھ اُن کے تجارتی قافلون کی مسلسل آمد و رفت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے،

جفاکش اور منچلے شتربان ہندوستان اور ایران کی تجارتی شہ رگ پر ہمیشہ سے قابض ہین، چنانچہ ایران، تاتار، چین اور روس کا سامان تجارت لے کر یہی لوگ ہندوستان آتے رہے ہین، بحری راستہ کھلنے سے پہلے ہندوستان کی یورپ سے تجارت بھی اسی قوم اور ملک کے ذریعہ سے ہوتی تھی، اور اگر ایرانی تاجر بھی آتے تھے، تو اُن کی پُرجرأت رہنمائی اور راہ دانی ہی کے بل بوتے پر اُن کا سفر بخیر و خوبی انجام پاتا تھا،

یہ افغانی تاجر اپنا سامان لے کر ملک کے ایک ایک گوشہ مین پہنچتے، اور مہینون برسون گشت اور رہن سہن کے بعد اپنے وطن کو واپس جاتے تھے، ان مین سے سیکڑون مرکزی آبادیون مین دکانین کھول کر رہ بس بھی گئے تھے، اور دیسی اور پردیسی سوداگرون کے درمیان آڑھتی اور ایجنٹ کی خدمات انجام دیتے تھے،

افغانی درویش اور عالم غزنوی عہد ہی سے افغانی اہل اللہ اور اہلِ علم نے بھی اس سرزمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کرنا شروع کیا تھا، جیسے جیسے اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، ان علومِ ظاہر و باطن کے معلمون نے بھی اپنی خانقاہین اور دار العلوم جا بجا قائم کرنا شروع کر دیئے، چنانچہ آخر مین لاہور سے بنگال اور کشمیر سے دکن تک اُن کا جال پھیلتا چلا گیا تھا، ان حضرات مین سے شاید کوئی ایک بھی یہان سے واپس اپنے وطن نہین گیا، رحلت کے بعد بھی اسی جنت نشان خطے کو اپنی آسودگاہ بنایا،

ان افغانی درویشون کا ہمارے ملک پر کتنا اثر پڑا، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہزارون کی فہرست مین سے صرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم کے نامِ نامی زبان پر لانا کافی ہوگا، جن کے سلسلے ملک کے گوشے گوشے کو اپنی روشنی سے منور کئے ہوئے ہین،

ان بزرگون کے حلقۂ اثر مین سلاطین، امرائے دربار اور عوام سب داخل تھے، جن مین ہندو بھی مسلمانون کے قدم بقدم نظر آتے تھے، یہ جب ہنوز دلی دور است اپنی زبان سے کہدیتے تو دلی دور ہی رہ جاتی تھی، اُن کے روحانی اثر ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندو تصوف مین بھی نئے نئے خاندان اور اسکول پیدا ہوگئے، اور صدیون کے جمود کے بعد یہان کے مذہبی اور روحانی فلسفے مین اسلامی قانون اور توحید کے عقیدے کی جھلک نظر آنے لگی تھی،

علمار کا دائرۂ عمل درویشون سے بھی زیادہ وسیع تھا، اسی بنا پر ان کا اثر بھی ہر کس وناکس پر زیادہ پڑا، اُس زمانہ مین علوم وفنون کی تحصیل کے لئے عربی اور حکومتی کاروبار کی خاطر فارسی زبان کا پڑھنا ضروری تھا، قاعدۂ بغدادی سے علومِ قرآن تک اور آمد نامہ سے سنائی، نظامی اور فردوسی کے کلام تک جملہ تعلیم کے یہی اہلِ علم کارپرداز تھے، اس کا ایک اہم ثبوت یہ ہے کہ جب سے ایرانی ہندوستان مین آنا شروع ہوئے ہین، یہان کی فارسی پر طنز کرتے رہے ہین، یہی نہین کہ ہندی لہجہ اُن کے لہجے سے جدا ہے، بلکہ ہندوستانی فارسی اُن کی نظر مین ایرانی محاورے کے بھی مطابق نہین ہوتی، اب آپ افغانستان کے اُس علاقے کے جہان فارسی بولی جاتی ہے، کسی شخص سے ملین اور بات چیت کرین تو مشکل ہی لسانی مغایرت کا احساس کر سکین گے، یہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ ہندوستانیون نے فارسی زبان شروع مین ایرانیون سے نہین سیکھی، افغانیون سے حاصل کی ہے ورنہ لہجے اور محاورے دونون مین معاملہ برعکس ہوتا،

چونکہ یہ لہجہ ہمارے سامعہ مین رچ گیا ہے، اس لئے ہمین بیحد عزیز ہے، اتنا عزیز کہ غالب جیسے ایران دوست نے بھی ایک شاگرد کو لہجۂ ایران کے تتبع سے روکا ہے، اور صرف محاورون کے استعمال کی اجازت دی ہے،

ہمایون کے وقت سے مغل دربار مین ایرانیون کا رسوخ بڑھا، اور دربار مین اُن کی قدر ومنزلت

اور افغانیت کی کس مپرسی سے ہندوستانیون مین احساسِ کمتری پیدا ہوا، لیکن خالص ہندی عنصر کی فارسی معدودے چند کے سوا ایرانی نہ بن سکی، اور پورے مغل عہد کے بہت سے جدت پسند دیوان، شعرا، ناثرون اور لغت نویسون کی بار بار کی روک ٹوک کے باوجود ایرانیون کی نظر مین لہجۂ ہندی اور سبکِ ہندی جیسی اصطلاحین آج بھی ہندوستانیون کی فارسی نظم ونثر کے لئے استعمال کی جاتی ہین، چنانچہ علامۂ شبلی مرحوم بھی فارسی مین اتنا کچھ لکھتے ہوئے سبکِ ہندی وارد کے الزام سے بری نہین ہین،

افغانی طلبہ

افغانستان کے طالبانِ علم بھی ہمیشہ سے ہندی مدرسون مین علوم وفنون کی تحصیل کے لئے آتے رہے ہین، پہلے بدعت وغیرہ کی تعلیم کی خاطر آتے تھے اسلامی دور مین علوم عربیہ سیکھنے آنے لگے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، پہلے اُن کے ہندوستان آنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہان کے سلاطین کی قدر دانی نے تمام دوسرے اسلامی ملکون سے زیادہ عالمون اور طلبہ کے لئے سہولتین مہیا کر دی تھین، صفوی عہد سے سنّی شیعہ عصبیت بھی کام کرنے لگی تھی، اور افغانیون کے لئے عموماً جو کٹر سُنّی ہوتے ہین، وہان کوئی گنجایش باقی نہ تھی، اس کے برخلاف ہندوستان مین مغلون کے عہد مین بھی کم از کم یہ بنیادی مغایرت کہین پیدا نہین ہوئی،

ان طلبہ کی جماعتین بھی ملک کے ایک ایک کونے مین جاتین، اور نورِ علم سے اپنے دل ودماغ کو روشن کرتی تھین، فارغ ہوکر جو افراد یہان معاشی سہولتین مہیا کر لیتے وہ واپس جانے کا خیال دل سے نکال ڈالتے، اور یہین شادی بیاہ کر کے بس جاتے تھے، آج بھی ہر سال سیکڑون افغانی ہندوستان مین پڑھنے آتے ہین، اور دہلی، سہارنپور، دیوبند، رامپور، مرادآباد، بریلی، لکھنؤ وغیرہ مین برسون رہ کر جاتے ہین، کچھ ایسے بے نیاز طبع بھی ہوتے ہین، کہ یہان کی موجودہ بے توجہی کی بھی پروا نہین کرتے، اور رہ پڑتے ہین،

نتیجۂ بحث

ظاہر ہے کہ جو قوم ہندوستان مین اتنے مختلف بھیسون کے اندر سیکڑون ہزارون برس سے آجا، اور رہ رہی ہے، اُس کا یہان کے تہذیب وتمدن، سیاست ومعاشرت اور زبان وادب پر اثر انداز نہ ہونا کس طرح باور کیا جا سکتا ہے، روہیل کھنڈ افغانون کا نسبتۂ تازہ وطن ہے، اور یہین

اُن کی آبادی زیادہ ہے، آپ رامپور، مراد آباد، بریلی، شاہجہان پور، فرخ آباد وغیرہ میں سے کسی شہر میں چلے جائیں، بڑی آسانی سے اور بہت جلد یہ محسوس کر لیں گے کہ وہاں کے تمام باشندوں کا رہن سہن، بول چال، رسم و رواج اور وضع قطع ملک کے دوسرے حصوں سے کسی نہ کسی حد تک جدا ہے، اور عام طور پر لوگوں میں افغانستانی سادگی، بیباکی، اور درشتی پائی جاتی ہے،

روہیل کھنڈ کی زبان اب سے پہلے یہاں کے روزمرہ میں بھی پشتو کے سیکڑوں لفظ داخل تھے[1]، عام اردو زبان کی مسلسل تعلیم نے ان مقامی محاوروں کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے، پھر بھی اس پورے علاقے میں بہت سے غیر مانوس لفظ آپ کے سننے میں آئیں گے، یہ سب لفظ پشتو کے ہیں، اور معمولی سے لفظی یا معنوی فرق کے ساتھ دن رات بولے جاتے ہیں،

مثلاً پشتو کے کچھ لفظ پیش کرتا ہوں، جو رامپور کے مردوں اور عورتوں کی زبان سے سُن کر میں نے جمع کئے ہیں، ان میں کا بڑا حصہ بالیقین روہیلکھنڈ کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی بولا، اور سمجھا جاتا ہے،

۱۔ آختہ کے معنی پشتو میں جتلا اور معروف ہیں، یعنی افغانی قبیلے "آختہ" بھی بولتے ہیں، رامپور میں یہی شکل مروج ہے، کوئی شخص کسی پر فریفتہ یا کسی عادت بد یا تکلیف دہ کام میں گرفتار ہو تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ "وہ اُس پر آختہ ہے یا فلاں بات میں آختہ ہے یا میں اپنی مصیبت میں آختہ ہوں"

---

[1] راورٹی نے الفنسٹن کی تصنیف "کابل" سے نقل کیا ہے، کہ روہیل کھنڈ اور ریاست رامپور کے علاقوں میں بعض قصبے اور گاؤں ایسے بھی ہیں، جہاں پشتو زبان بولی جاتی، اور عام کاروبار کا ذریعہ ہے، ملاحظہ ہو پشتو انگریزی ڈکشنری، دیباچہ: ۵، صاحبزادہ عبد السلام خان بہادر مرحوم نے نسب افاغنہ (ص ۷، مطبوعہ مطبع سکندری ۱۳۳۵ھ) میں ۳۰ لفظ پشتو کے لکھے ہیں، جو اُن کے زمانہ میں رامپور کی زبان میں داخل تھے، اُنھوں نے لکھا ہے کہ یہ سرسری فہرست ہے، تحقیق سے اور بہت سے الفاظ نکلیں گے، میرے پیش کئے ہوئے الفاظ کی تعداد میں سے صرف چند لفظ داخل ہیں،

۲۔ "اڑخ" پشتو میں پہلو کو کہتے ہیں جب افغانی "اڑخ پہ اڑخ" بولتے ہیں، تو اُن کی مراد "پہلو بہ پہلو" ہوتی ہے، رامپور میں "اڑخ لگنا" ایک محاورہ بن گیا ہے جس کے معنی "مراد بر آنا" یا "پوبارے ہونا" لئے جاتے ہیں، اور مستورات عام طور پر اسے استعمال کرتی ہیں،

۳۔ "انس"۔ پشتو میں قبیلہ یا خاندان کو کہا جاتا ہے، یہ ترکی اولوس کا بگاڑ ہے، رامپور میں "الزام" ہی مخصوص ہو گیا ہے، اور عورتیں کوستے ہوئے کہا کرتی ہیں، "تیرا انس سے پیالہ جدا ہو جائے" یعنی کوڑھی ہو جائے، لوگ تجھے اپنے ساتھ کھلانے پلانے سے پرہیز کریں، کسی کی بدنامی اور تشہیر کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی کہتی ہیں "ساری انس ہا ہا کار ہے" کبھی بولتی ہیں "اس سے انس واقف ہے"

۴۔ "انگرا، کھنگرہ" روہیلکھنڈ میں کاٹ کباڑ کو کہتے ہیں، یہ بھی پشتو کے لفظ ہیں، "انگڑ" افغانستان میں عمارت کو، اور "کنگ خرہ" اس کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں، جو سیلاب میں بہ کر آتا، یا دریا کے کنارے پر جمع ہو جاتا ہے، رامپور وغیرہ کے لہجے نے اُسے "کھنگڑ" بنا کر ہندیوں کی زبان پر بھی چڑھا دیا ہے[1]،

۵۔ "اوب" بواو مجہول رامپور میں عزت و آبرو کا مترادف ہے، لوگ کہتے ہیں "میں نے تمہارے خاندان میں اوب لگا دی، یا اُس میں ایسی کیا اوب لگی ہے جو آپے سے باہر ہے"

"اوبہ" پشتو میں فارسی آب اور اردو پانی کا مترادف ہے، آب سے آبرو وغیرہ مراد لینا عام بات ہے، اس اصول کے تحت "اوبہ" کی ہائے ہوز گرا کر "اوب" سے مجازی معنی مراد لئے جانے لگے،

۶۔ "اوربل" بواو معروف و مجہول، پشتو میں بالوں کی اُن لٹوں کو کہتے ہیں، جو جوان عورتیں اپنی دونوں کنپٹیوں پر جماتی ہیں، یہ ردادرٹی کا بیان ہے، نواب محبت خان بریلوی نے "ریاض المحبت"

---

[1] انگڑ کھنگڑ کو ہندی بھی کہا جا سکتا ہے، اس لئے کہ انگھرٹا کے معنی بے گڑھا یا بے ڈول ہیں، اور کھنگڑ جلی اینٹ اور لوہے وغیرہ کے میل کچیل کو کہتے ہیں، لیکن عام اردو زبان میں اس مرکب کے عدم استعمال سے میں نے پشتو ہونے کا قیاس قائم کیا ہے،

مین لکھا ہے کہ "ادربل" مشاطہ کا دلھن کے سر کے بال گوندھنا کہلاتا ہے، بہرحال روہیل کھنڈ مین بھی یہ لفظ (بواو مجہول) بولا جاتا ہے،

پٹھانون مین دستور ہے کہ مانجھے (جسے رامپور مین مایون کہتے ہین) کے دن دلھن کی الٹی کنپٹی کی ایک لٹ مین کلاوہ گوندھ کر ماتھے پر سے سیدھی کنپٹی اور وہان سے کان پر لیجا کر پیچھے چوٹی مین باندھ دیتے ہین، نکاح کے بعد دولھا کو زنانے مین بلا کر اس سے کلاوہ کھلوایا جاتا ہے، اور اس رسم کو "ادربل کھولنا" کہتے ہین، روہیل کھنڈ مین اب یہ رسم مسلمانون مین عام ہے،

انشا کے زمانہ مین "ادربل" دہلی مین بھی بولا جاتا تھا، اور اس سے "کس" مراد ہوتی تھی[۱] موجودہ لغت کی کتابون مین اس کا ذکر نہین ملتا،

۷۔ روہیل کھنڈ مین احمق، نادان اور وحشی صفت انسان کو "ہُوش" بواو معروف کہتے ہین، بعض مفکر اسے "وحوش" کا بگاڑ بتاتے ہین، میری رائے یہ ہے کہ پشتو کے "اُوش" نے یہ چولا بدلا ہے، جس کے معنی اونٹ ہین، یہ جانور سیدھا سادا سا ہوتا ہے، اس صفت کو دیکھ کر احمق اور نادان کے لئے استعارہ کر لیا گیا،

۸۔ بچو نگڑے: پشتو مین "بچوا" کا مترادف ہے، رامپور مین بھی از راہ تحقیر و محبت (ہر دو) کسی کو "بچو نگڑا" کہا جاتا ہے،

۹۔ بربنڈ: پشتو مین ننگے کو کہتے ہین، رامپور اور دوسرے روہیلکھنڈی علاقون مین بیباک، بے شرم کو بربنڈ کہا جاتا ہے،

۱۰۔ "بلا نیسے" پشتو مین تیرا ناس جائے، کا ہم معنی ہے، رامپور مین "ہماری بلا سے" کی جگہ بولا جاتا ہے،

---

[۱] دریائے لطافت: ۱۷۶، طبع مرشد آباد ۱۸۵۰ء

۱۱۔ بُنبد، کا پشتو تلفظ بکسر اول ہے، روہیل کھنڈ مین اب تک بے پڑھے لکھے بُنبد خان، اور اختر بُلند خان کو بلند خان، اور اختر بلند خان کہتے ہین،

۱۲۔ گیہون وغیرہ کی بال کو پشتو مین "ئبل" کہتے ہین، رامپور مین صرف نرکل جیسے بڑے پودے کی بال ئبل کہلاتی ہے،

۱۳۔ "بلا غنڈ" رامپور مین بیل کو کہتے ہین، یہ بھی پشتو ہے، "بلا" تو غالبًا وہی عام لفظ ہے، اور "غنڈ" پشتو مین گول کا ہم معنی ہے، چونکہ یہ پھل سچ مچ بلا کا گولا ہے، اس لئے اہل رامپور نے بیل جیسے ہلکے پھلکے لفظ کی جگہ "بلا غنڈ" ایسے بھاری بھرکم لفظ ہی کو برقرار رکھا ہے،

۱۴۔ رامپور مین جوان لڑکی کو بُوتہ ہوگئی، جوان بوتہ ہے، بوتہ کا بوتہ ہے، وغیرہ جملون سے یاد کیا جاتا ہے، یہ "بُوتہ" پشتو کے "بُوتے" سے بنا ہے، جس کے معنی اونٹ کا بچہ ہین،

۱۵۔ "پاڑو" پشتو میں سانپ کا منتر جاننے والے کو کہا جاتا ہے، رامپور مین اپنی علمیت جتانے والے سے طنزًا کہتے ہین، "جی ہان، آپ بڑے پاڑو ہین"[۱]

۱۶۔ پخ: فارسی زبان مین شاباش کا مترادف ہے، پشتو مین بلی کی وہ آواز "پخ" کہلاتی ہے، جو حملے کے وقت پیدا ہوتی ہے، روہیل کھنڈ مین لوگ کہا کرتے ہین: میان کس پخ مین پڑے ہو؟ بانم نے اپنے پیچھے یہ کیا پخ لگالی ہے" اور اس پخ سے مصیبت یا جھگڑا مراد لیتے ہین،

۱۸۔ پرزو، پیرزو، پرزونہ، پیرزونہ، یہ چارون لفظ پشتو کے ہین، پہلے دو کے معنی خواہشمند

---

[۱] پاڑو کے بارے مین یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصل مین "پاڑھو" ہے، اور پڑھنا سے اس کا اشتقاق ہوا ہے، مگر یہ بات مین نے اس لئے اختیار نہین کی ہے، کہ اولًا تو لغات اردو مین یہ لفظ ملتا نہین، دوسرے روہیل کھنڈ کے باہر میرے سننے مین نہین آیا، اگر اور جگہ بھی عوام کی زبان مین پایا جاتا ہو تو مجھے اس کے ہندی ماننے مین تامل نہ ہوگا،

مشتاق، موزون اور مناسب اور آخری کے اشتیاق اور موزونیت ہیں، مستورات رامپور کی زبان پر پیرزونہ
اور پیرزونہ جاری ہیں، اور اُن سے محبت اور خیال مراد لیتی ہیں، کوئی تھوڑی سی چیز تحفے میں دے تو کہا جاتا
ہے کہ تھوڑے بہت کا کیا دیکھنا ہے، ان کا ہم پر پیرزو تو ہوا" یا ازراہ شکایت کہتی ہیں، "واہ بہن ہم پر فلاں
چیز کا پیرزونہ نہ ہوا"

۱۹۔ پرکٹے پشتو میں اُس لڑکے کو کہتے ہیں جس کا باپ مرچکا ہو، اور اس کی ماں نے دوسرے شخص سے
نکاح کرلیا ہو، اب یہ لڑکا اپنی ماں کے اُس دوسرے شوہر کا پرکٹے ہوگا، اور لڑکی پرکٹی کہلائے گی، اردو
زبان میں اس رشتے کے اظہار کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے، رامپور میں بھی یہی لفظ مستعمل ہیں، صرف "پرکٹے"
کو پرکٹا بنا لیا ہے،

۲۰۔ پشتو میں "پردہ" کو "پڑدہ" بولتے ہیں، یہی لفظ رامپور میں بھی مروج تھا، مگر اب بالکل ہی اٹھ
بولتے ہیں، غالباً اس اصول کے تحت "مرد" کو "مرڈ" اور درد کو دڑد بھی کہا جاتا ہے، اب یہ بھی مرد اور درد
بن چکے ہیں،

۲۱۔ افغانستان میں بلے کو پشے اور بلی کو پشی کہتے ہیں، کہتے ہیں، اور نر و مادہ دونوں کے لئے
پشو مستعمل ہے، رامپور میں بلی پشو، اور پشی اور بلا پشوا کہلاتا ہے،

بلی کو بلانے کے لئے پشتو میں پش پش، اور بھگانے کے لئے پشے پشے، اور پشہ کی آوازیں نکالی جاتی
ہیں، رامپور میں بھی یہی دھتکار مروج ہے، البتہ پکار کو "پش پش" بنا لیا ہے،

۲۱۔ پکار، پشتو میں کام کو کہتے ہیں، رامپوری مرد اور عورتوں سب میں یہ لفظ مروج ہے اور
منفی جملوں میں استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے، "فلاں چیز میرے کسی پکار کی نہیں" یا "یہ چیز ہے کس پکار

۱؎ اس لفظ میں نون کا تلفظ اس طرح کیا جائے گا، جیسے ہندی لفظ گنگی، گورجی میں کیا جاتا ہے، پشتو زبان میں مؤنث
اسماء کے آخر میں یہ ئی پائی جاتی ہے جو علامات تانیث میں سے ایک علامت ہے۔

کی"، اسی طرح بیکار چیز کو "ناپکارہ" کہتے ہیں، یہ بھی پشتو ہے، مگر وہاں مونث تھا، یہاں علم ہے، در اصل
یہ لفظ فارسی "بیکار" کی افغانی شکل ہے، اس لئے افغانی اور رامپوری دونوں "نابکار" کی جگہ ناپکار بولتے ہیں،

۲۲۔ خوف اور تھکن سے سانس اکھڑ جائے، یا جی گھبرانے لگے تو رامپور میں عورتیں کہتی ہیں جی
اورے پورے ہوگیا، یا سانس اورے پورے ہوگئی،"

یہ اورے پورے بواو مجہول بھی پشتو لفظ ہیں، مگر یہاں آکر اُن کی صوت اور معنی دونوں بدل
گئے ہیں، افغانستان میں پُوراُور بولتے ہیں، اور اس کے معنی ہیں بالکل پورا، ادھر سے اُدھر
تک، آر پار،

۲۳۔ پُوس، پشتو میں احمق اور نادان کو کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں پُوسا یا پوساجی سے
بھولے بھالے اشخاص کو مخاطب کیا جاتا ہے،

۲۴۔ تحۃ یا تکمیل کو پشتو میں بیزوان کہا جاتا ہے، کوئی شخص کسی بات کو بار بار دہرائے، یا کوئی
چیز بار بار مانگے، تو رامپور کی عورتیں کہتی ہیں "تم نے تو اس کو میری ناک کا بیزوان بنا لیا"

۲۵۔ کنواری لڑکی کو پشتو میں پیغلہ کہتے ہیں، رامپوری مستورات
بھی طنز کے موقع پر کہا کرتی ہیں، "ہے کیسی پیغلہ" یا "دیکھو تو اسی پیغلہ کو باتیں کیسی
بناتی ہے"

۲۶۔ "بیغور" پشتو میں طعن و تشنیع کو کہتے ہیں، رامپور میں عورتیں "طعن بیغور" اور "طعنے بیغورے" بولتی ہیں

۲۷۔ رامپور میں امرد کو "پے مُکھا" کہتے ہیں، یہ بھی پشتو کے ایک لفظ کا بگاڑ ہے، افغانستان میں
"پَیَ" دودھ یا عرق اور "مخ" چہرہ کہلاتا ہے، "پی مخے" خوبصورت مرد اور "پی مخہ" عورت کے لئے استعمال
ہوتا ہے، بے داڑھی مونچھ کے لڑکے کو بھی افغانی "پی مخے" کہتے ہیں، اسی لفظ نے پہلے پے مخے اور بعد ازاں
"پے مکھا" کی شکل اختیار کر لی ہے،[1]

۱؎ حاشیہ ص آئندہ پر ملاحظہ ہو،

۲۸. پتوس بواو مجہول، پشتو مین جستجو اور تلاش کو کہتے ہین، کرنل راورٹی اسے عربی مصدر "تفحص" کا بگاڑ بتاتا ہے، بہرحال یہ لفظ بھی روہیل کھنڈ بھر مین بولا جاتا ہے،

۲۹. تخ مخ: افغانی "شرم شرم" کی جگہ بولتے ہین، رامپور مین تخ مخ ہو گیا بولتے ہین، اور اس سے تخ مخانا مصدر بنالیا ہے جو "شرمانا اور تلملانا" دونون کے بجائے استعمال ہوتا ہے،

۳۰. پشتو مین چچازاد بھائی کو "تربور" کہتے ہین، چچازادون مین عموماً بیر ہوتا ہے، اس لئے رامپور مین اس التزامی معنی یعنی دشمن کی جگہ بولا جاتا ہے،

۳۱. "ترشونہ" پشتو زبان مین "ترس" کی جمع ہے، رامپور مین اسے "ترسون" بنا کر رنج وغم، دکھ اور پریشانی کے معنی میں استعمال کرتے ہین، اور عورتین کہتی ہین "اُس کا بڑا ترسون ہوا" یا فلان کا ترسون نہین دیکھا جاتا،

۳۲. ماتھے کو پشتو مین "تندے" کہتے ہین، روہیلکھنڈ مین کھوپڑی کو "تندی" بولتے ہین،

۳۳. "تبل" پشتو مین عربی دف کا مترادف ہے، راورٹی کی رائے مین یہ طبل سے بنایا گیا ہے، بہرحال یہ پٹھانون کا قومی ساز ہے، اور چاربیت گانے مین جوش کے ساتھ بجایا جاتا ہے، روہیل کھنڈ اور بھوپال و ٹونک وغیرہ افغانی بستیون مین یہ اسم پٹھانون کے ساتھ آیا ہے، اور اسی کا مستی چاربیت گانے مین یہان بھی بجایا جاتا ہے،

۳۴. "تل" پشتو مین نیچے کو کہتے ہین، روہیل کھنڈ مین بچے "تل پہ تل" نام کا ایک کھیل کھیلتے ہین، صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک بچہ دوسرے کی پیٹھ پر سوار ہوتا ہے، اور مرکب کو ادھر اُدھر پھراتا ہے، مرکب

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۷) یہ سنسکرت مین بھی دودھ اور عرق کو کہتے ہین، اور مخ ہندی "مکھ" ہے، لیکن اس سے خیال نہ کرنا چاہئے کہ "تخ مخ" بھی ہندی ساخت ہے، اس لئے کہ اردو یا ہندی کسی لغت مین اس کا تذکرہ نہین اور نہ یہ لفظ روہیل کھنڈ کے باہر بولا جاتا ہے۔

ہر آیندہ و روندہ سے پوچھتا ہے، "چچا تل پہ تل، یا چڑھے چڑھائے"، اگر جواب مین کہا گیا "چڑھے چڑھائے" تو سوار اور سواری اپنی حالت پر برقرار رہے، ورنہ جو لڑکا اب تک مرکب تھا، وہ راکب کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے، اور پھر آنے جانے والون سے وہی سوال دہرایا جاتا ہے،

یہ تل پہ تل ٹھیٹ پشتو ہے،

۳۵. موٹے تازے اور بھاری بھر کم آدمی کو دیکھ کر روہیل کھنڈی کہتے ہین: "ذرا اس کا تن توش تو دیکھو" یا "فلان بڑے تن توش کا آدمی ہے"، یہ تن توش بھی پشتو ہے، فرق اتنا ہو گیا ہے کہ وہان اس کے معنی نادیدہ تھے، یہان فربہی اور جسامت کی زیادتی مراد لی جانے لگی، جو اصل کے التزامی مفہوم کی حیثیت رکھتی ہے،

۳۶. ننھے بچے کو پشتو مین "ننگے" کہتے ہین، رامپور مین مستورات کی زبان سے یہ لفظ بھی اکثر آتا رہتا ہے، اور طنزاً کہتی ہین، "جی ہان تم ہو بھی تو ننگئی یا ننھی ننگئی جو اتنی سی بات بھی نہین سمجھتیں" مرد کے لئے یہان "ننگیا" استعمال ہوتا ہے،

۳۷. "تور" بواو مجہول کے معنی پشتو مین اندھیرا خوف دہشت اور بہتان ہین، روہیل کھنڈ مین خوف اور بہتان کے مفہوم مین بولا جاتا ہے، اور لوگ کہتے ہین، "خدا اندھی کے زور اور حاکم کے تور سے بچائے"، عورتین خفگی مین کہا کرتی ہین: "یا اللہ مین کس تور مین پکڑی گئی ہون"،

پٹھانون مین ایک قبیلہ دوسرے سے دب کر صلح کرے، تو اپنے یہان کی ایک دو لڑکیان بھی غالب کے خاندان مین بیاہ دیتا ہے، اسے لڑکی تور مین دینا کہتے ہین، ساس بہو کی لڑائی مین اکثر بہو کی زبان سے یہ جملہ سننے مین آتا ہے، "کیا مین تور مین آئی ہون" جو تم سے دن رات جوتیان کھاؤن گی، یہ وہی تور بمعنی خوف و دہشت ہے،

۳۸. گھٹا ٹوپ اندھیرے کو پشتو مین "تورتم" کہتے ہین، یہ مذکورہ بالا تور کا مرکب ہے، رامپور

مین ظلم وستم کی جگہ بولا جاتا ہے، اور عورتین کہا کرتی ہین، "اللہ رے تیرے تورتم یا اُس نے وہ تورتم مچایا (یا ڈھایا) کہ خدا کی پناہ!"

۳۹۔ تَش تُش، پشتو مین بندوق کی آواز کو کہتے ہین، روہیل کھنڈ مین لوگ بولتے ہین، "بندوق تَش سے ہو کر رہ گئی" یا "مین نے تَش سے گولی ماردی" یا "وہان دو چار بار تَش تُش ہو کر رہ گئی"

۴۰۔ ٹیر پشتو مین ٹاٹ کہلاتا ہے، ہمارے علاقہ مین اسے مشدد بولتے ہین،[۱] اور کوئی شخص کسی کا مال دبالے، یا ناجائز ذرائع سے بہت سا کمالے، تو لوگ کہتے ہین، "فلان نے تو ٹیرّ الٹ دیا یا ٹاٹ دیا" گھوڑون کا میلا جس ٹاٹ پر کوٹا جاتا تھا، اُسے بھی ٹیر کہتے تھے، اب اصطبل کی جگہ موٹر خانے کومل گئی اس لئے ٹیر بھی جل کر راکھ ہو گیا،

۴۱۔ پشتو مین سست اور کاہل کو تَش مَس کہتے ہین، روہیل کھنڈ اسے ذرا بگاڑ کر بولتے ہین، اور کوئی شخص ڈھنگی یا خوشامد کا اثر نہ لے، تو کہتے ہین "ٹس سے مَس نہ ہوا"!

۴۲۔ "ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کو پشتو مین "ٹخ" کہتے ہین، ہمارے یہان یہ لفظ بھی بتغیر بولا جاتا ہے" کسی خوف یا حیرت سے آنکھین پھٹی کی پھٹی رہ جائین، تو کہتے ہین "دیدے ٹخ ہو کر رہ گئے، یا بیچاری ٹخ دیدہ رہ گئی"

رامپور مین عورتون نے اس سے ٹخّو بنایا ہے، اور گالی کے طور پر استعمال کرتی ہین،

۴۳۔ ٹونگ پشتو مین دق کرنے چھیڑنے اور نامزا حرکت سے ناراض کرنے کو کہتے ہین، روہیل کھنڈ مین ایک مصدر ٹُنگیانا استعمال ہوتا ہے، بعض اس کا تلفظ ٹھنگیانا بھی کرتے ہین، پہلے میرا خیال تھا کہ

[۱] صاحب نور اللغات نے لکھا ہے کہ "ٹیر" ہندی مین وہ چھپر کہلاتا ہے، جو دوسرے چھپر کے اوپر ڈالا جائے، رامپور کی محاورے مین جو "ٹیر" ہے، وہ معنی اس ہندی لفظ سے علاقہ نہین رکھتا، البتہ لفظ مین اتنی متعزد اثر قبول کیا ہے،

ٹونگ "سے بنا ہے، مگر ہندی مین اس کا پتہ نہین چلتا تھا، اب مین یقین رکھتا ہون، کہ اسے پشتو ٹونگ" سے بنایا گیا ہے،

۴۴۔ روہیل کھنڈی مستورات کی بول چال ہے: "اس چلبیا بھنبیا کی بات کون پوچھے" یا "مین زعمر بھر کی جلبیا دکھیا ہون" "یہ جلبیا" بھی پشتو سے آیا ہے، اور اس کے معنی ہین جلا ہوا، ہندی یا اردو مین اس لفظ کا پتہ نہین چلتا،

۴۵۔ "چیڑدخ" پشتو مین ایک کھیل کا نام ہے جو گول پتھرون سے کھیلا جاتا ہے، روہیل کھنڈ مین اس سے التزامی معنی شور وغل مراد ہوتے ہین، اور بچے شور مچاتے ہین، تو کہا جاتا ہے کہ "ارے یہ کیا چیڑدخ مچائی ہے یا لگائی ہے"،

۴۶۔ غم کے اُبھان کو پشتو مین "چپہ" یا "چپے" کہتے ہین، ہمارے یہان "چپہ" ہو کر مستورات کے دل پر پڑتا ہے، اور کہا جاتا ہے "فلان بات سنتے ہی دل پے چپہ پڑ گیا، یا اکیلی بیٹھے بیٹھے میرے دل پے چپے پڑتے ہین"،

۴۷۔ "جُن" اور "جنجن" پشتو مین میلا کا مترادف ہے، روہیل کھنڈ مین بھی اس مفہوم مین "میلاجن" یا "میلاجنجن" بترکیب استعمال ہوتا ہے،

۴۸۔ پشتو مین حال یا کیفیت کے لئے "حال احوال" بولا جاتا ہے، ہمارے علاقہ مین حال حوال بولتے ہین،

۴۹۔ "خدزیات" افغانستان اور روہیلکھنڈ دونون مین زیادہ سے زیادہ کی جگہ بولتے ہین، کہا جاتا ہے کہ "وہان خدزیات پندرہ بیس آدمی ہون گے"

۵۰۔ حیران کو پشتو مین "حق حیران یا "حق ہریان" کہا جاتا ہے، رامپور مین بھی مستورات کا محاورہ یہی ہے،

۵۱۔ "خُڑا" پشتو میں قے کرنے کی آواز کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں اس سے خڑخڑ اور خڑخڑانا بنالیا ہے۔

۵۲۔ "خَر پِشُوی" پشتو میں سور کا مترادف ہے، رامپوری تحقیراً مرد کو "خر پشا" اور عورت کو "خر بشی" کہتے ہیں،

۵۳۔ رامپوری مستورات "حرامی پلا" کی جگہ حرامی "خڑیڑا" بولتی ہیں، یہ خریڑا پشتو کے "خریڑے" سے بنا ہے، برسات کے موسم میں جو چھتری کی طرح کے چھوٹے چھوٹے پودے اُگتے ہیں، اور اردو میں سانپ کی چھتری یا کُکرمتّا اور عربی میں فُطر کہلاتے ہیں، پشتو میں انھیں "خَریڑے" کہا جاتا ہے، پہلے رامپور میں بھی فطر کے لئے یہی لفظ عام طور پر استعمال ہوتا تھا، اب متروک ہے، مگر اسے ذرا بگاڑ کر حرامی کے لئے خریڑا برابر بولا جاتا ہے[۱]،

۵۴۔ "خوار، خوار خستہ" مفلس کو اور "خواری" افلاس کو اور "خوارہ کی" قلاش عورت کو افغانستان اور روہیلکھنڈ دونوں جگہ کہا جاتا ہے،

۵۵۔ "خور" بواو مجہول، پشتو میں بہن کو کہتے ہیں، اس کی جمع ہے "خورے" رامپوری مستورات ادمی "خوارے" بولا کرتی ہیں،

۵۶۔ "خڑوب" بواو مجہول، پشتو میں پانی سے بھیگی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں "خڑ" اور "خڑوب دینا" پانی میں بھگو دینے کو بولتے ہیں، رامپور کے بعض آدمیوں کی زبان سے "غڑوب" بھی سُنا ہے،

---

[۱] پشتو ہی کا ایک لفظ "گریڑہ" ہے، جو اس گھاس کے لئے استعمال ہوتا ہے، جسے کھتائی کے بعد کھیت میں اکٹھا کرکے باہر پھینک دیا جاتا ہے، بعید نہیں کہ اس میں تغیر کرکے خریڑا بنالیا ہو، مگر یہ احتمال بعید معلوم ہوتا ہے،

۵۷۔ روہیل کھنڈ میں نونہال کی جگہ "خُوڑین خُدیق" استعمال کیا جاتا ہے، یہ بھی پشتو سے آیا ہے، اور زخمی کا ہم معنی ہے،

۵۸۔ تھیلے کو پشتو میں "خَلتَہ" کہتے ہیں، ہمارے یہاں "خلتہ" تھیلے کو اور "خلتیا" تھیلی کو بولتے ہیں، پاجامے کے کپڑے کو تراشنے سے پہلے لمبائی میں سی کر پھر کاٹا جاتا ہے، اسے پاجامے کا "خلتہ" اور اس عمل کو "خلتہ کرنا" کہتے ہیں،

۵۹۔ افغانستان میں منھ کو "خُلَہ" کہا جاتا ہے، اور اس کی تصغیر "خلگے" ہے، روہیل کھنڈ میں منھ یا دہن کو "خُلگی" بولتے ہیں، اور کہتے ہیں "اُس کی خلگی چوڑی ہے، یا چھوٹی ہے"،

۶۰۔ "دم لینا" کی جگہ ہمارے یہاں "دَمَہ لینا" بولتے ہیں، یہ لفظ بھی پشتو ہے،

۶۱۔ "خواست" فارسی مصدر خواستن سے مشتق ہے اور پشتو میں بمعنی خواہش بولا جاتا ہے، رامپور میں بھی عورتیں کہتی ہیں، "میں نے بڑی خواستیں کیں تب وہ آئی"

۶۲۔ "دیدن" فارسی مصدر کو پشتو میں بمعنی دیدار استعمال کرتے ہیں، رامپوری مستورات "مردے کا دیدن کرنا" بولتی ہیں،

۶۳۔ بیہوش کا پشتو مترادف ڈب ڈوب ہے، بخار میں بیہوش پڑے ہوئے کو رامپوری عورتیں کہتی ہیں، "ڈب ڈب پڑا ہے"،

۶۴۔ "ڈڈہ" پشتو میں پہلو اور "ڈڈہ لگول" ایک پہلو پر لیٹ جانا ہے، رامپور میں یہ اتنا عام ہے، کہ عالم و جاہل اور مرد و عورت سب دن رات بولتے ہیں، روہیل کھنڈ کے دوسرے مقامات پر بھی حتی کہ دیہات میں لوگ "ڈڈّہ لگالو" اور کرسی یا مسہری کا "ڈڈہ" کہا کرتے ہیں، فرق صرف دوسری ڈال کی تشدید کا ہے، کہ یہ ہندوستانی اضافہ ہے،

۶۵۔ "ڈڑیں مارنا" رامپور میں شیخی بگھارنے کو کہتے ہیں، پشتو میں "ڈوزے" بَلکہ اس مفہوم میں

استعمال ہوتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ ہمارا "ڈز" اور "ڈزین" پشتو کے "ڈوزہ"، اور "ڈوربے"
کا بگاڑ ہے،

۶۶۔ "ڈنگ ڈنگ" افغانستان اور روہیل کھنڈ دونون جگہ باجے اور خاص کر ڈنکے کی آواز
کہلاتی ہے،

۶۷۔ "ڈیوہ، ڈیولا، ڈیوٹ، ڈیوہ، سلائی" یہ سب لفظ پشتو ہین، اور روہیل کھنڈ مین
افغانی اثر سے پھیلے ہین، ورنہ ان کا ہندی تلفظ حرف دال سے ہے،

۶۸۔ "راشہ درشہ" پشتو مین میل ملاقات کہلاتی ہے، رامپور مین بھی عوام اسی مفہوم مین استعمال
کرتے ہین،

۶۹۔ "روغ جوڑ" بہ دو بواو مجہول بھی پشتو مین میل ملاپ کا مترادف ہے، رامپور کی مستورات
مین لفظ "روغ" تین لفظون کے ساتھ ترکیب پاکر بولا جاتا ہے، ایک تو یہی "جوڑ" چنانچہ "روغ جوڑ"
اور "روغ جوڑہ" دونون سے میل ملاپ مراد لیتی ہین، دوسرا مرکب "روغ راستی" ہے، جس سے مطلب
نرمی اور ہم آہنگی اور محبت ہوتا ہے، مثلاً دیکھو مین نرو روغ راستی ہین (یا سے) کہہ رہی ہون، اور
تم ہو کہ آپے سے باہر ہوئی جاتی ہو، اور تیسرا مرکب "روغ موٹ" ہے، جس کے معنی ہٹا کٹا موٹا تازہ ہے،

۷۰۔ ہمارے علاقے ہی مین نہین غالباً بھوپال، ٹونک، اور جاورہ وغیرہ تمام افغانی
آبادیون مین دستور ہے کہ کسی کے گھر مین بیٹا پیدا ہو، تو زچہ اور بچے کے کام سے نبٹ کر خاندان کی عورتین
صحن مین، اگر گھر مین بالاخانہ نہو، ورنہ کوٹھے پر چڑھ کر "زامے خورے" پکارتی ہین، اور اس کے بعد
خاندان اور پڑوس مین مٹھائی بانٹی جاتی ہے،

یہ رسم بھی افغانستان سے آئی ہے، اس کے آغاز کا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص قتل
کر دیا گیا تھا، اور اس کا بدلہ لینے والا کوئی نہ تھا، ایک حاملہ بیوی اور ایک بیوہ بہن دو عورتین

گھر بھر مین رہی تھین، بہن دعائین مانگتی تھی کہ بیٹا پیدا ہو، جو بڑھ کر باپ کا انتقام لے، اتفاق سے بیٹا
ہی پیدا ہوا، بچے کی پھپی فرطِ خوشی مین مکان کی چھت پر چڑھ گئی، اور آس پاس کی عورتون کو بلند آواز
سے پکارنے لگی، "زامے خورے، راغے زدہ می" یعنی بہنو آؤ، بیٹا آیا، اس وقت سے یہ رسم افغانستان
مین جاری ہوئی ہے،

ہندوستان آکر لفظ بدل گئے، مگر روح اتنی خوش آیند تھی کہ پٹھانون کی دیکھا دیکھی دوسری
مسلمان قومون نے بھی اس رسم کو اپنا لیا، اب روہیلکھنڈ مین یہ تمام مسلمانون کے قومی رواسم مین شمار
ہوتی ہے،

۷۱۔ "زن کدن" اور "زن قدن" پشتو مین جان کنی یا دم اکھڑنے کو کہتے ہین، روہیلکھنڈ مین "زن
قدن" اور "زن قدنی" بولتے ہین،

۷۲۔ دکھ اور رنج کو پشتو اور رامپوری بولچال دونون مین "زور" بولتے ہین،

۷۳۔ "زیارت" عربی لفظ ہے، اور ملاقات کے لئے وضع ہوا ہے، پشتو مین کسی بزرگ کے مزار
کو "زیارت" کہتے ہین، یہی مفہوم روہیل کھنڈ مین بھی مراد ہوتا ہے، اور شاہ بلاقی صاحب کی زیارت
مرادآباد مین اور حافظ جمال صاحب کی رامپور مین مشہور خاص و عام ہے،

۷۴۔ "زیرئے" پشتو مین یرقان کو کہتے ہین، رامپور مین اسے "زرٓیا" بنا لیا ہے،

۷۵۔ سالی کے شوہر کو ہندی مین "ساڑھو" کہتے ہین، پشتو مین "سانڑو" کہا جاتا ہے، اور یہی
روہیل کھنڈ مین بھی مروج ہے،

۷۶۔ افغانستان مین ایک شخص کھانا کھا رہا ہو، اور دوست احباب مین سے کوئی آپڑے تو اس
سے شرکتِ طعام کی جو درخواست کی جاتی ہے، اس عمل کو "ست کول" کہا جاتا ہے، روہیل کھنڈ مین بھی
"کھانے کا ست کرنا" ہی بولتے ہین، اور صلاح و مشورے کے لئے "ست صلاح کرنا" مستعمل ہے،

۔۔ بچّہ کو افغانی "ٹخار" بولتے ہیں، یہی تلفظ ہمارے علاقہ میں بھی زبان زد ہے،

۔۔ دشمن کی تکلیف پر خوش ہونے کو پشتو میں "تخہ" کہتے ہیں، مستورات رامپور کہا کرتی ہیں،

دل کے تخے پورے کرتی ہے، یعنی تکلیف پر خوش ہوتی ہے،

۔۔ دم واپسین کو پشتو میں "سلگئی" کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں بھی لوگ کہتے ہیں؛ "پچھلی سلگی"

اور سگین ہو رہی ہیں"

۔۔ "سنڈہ" پشتو میں بھینسے کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں عورتیں بچّوں کو ڈانٹتے ہوئے کہتی ہیں:

"خر تو سنڈے جوان سنڈا یا جوان سنڈی سی ہو گئی، مگر شعور نہیں آیا" بھی بولا جاتا ہی،

۔۔ نواب الہ یار خان نے عجائب اللغات میں لکھا ہے، کہ پشتو میں سادہ کو "سودہ" کہتے

ہیں، ہمارے یہان سادہ سودہ مرکب استعمال کرتے ہیں،

۔۔ برابری کو پشتو میں "سیالی" کہتے ہیں، ہمارے یہان بھی اس کا عام رواج ہے، (باقی)

سیر الصحابہ

جلد اوّل خلفاے راشدین

اس میں خلفاے راشدین کے ذاتی حالات و فضائل مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات

کا مفصّل بیان ہے، ضخامت صفحے، قیمت

جلد دوم مہاجرین اول

اس میں خلفاے راشدین کے علاوہ بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ، اکابر بنی ہاشم و قریش، اور ان

صحابہ کے حالات و سوانح اخلاق اور فضائل کی تفصیل بیان کی گئی ہو جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے،

قیمت عہ ضخامت ۴۹۰ صفحے، "مینجر"

ہندوستان کے کتب خانے

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

(۲)

شاہجہان کا کتب خانہ شاہجہان بادشاہ کے عہد ۱۰۶۳ھ میں اس کتبخانہ کے ناظم کچھ دنون کے لئے سید علی

ابن سید جلال مقصود عالم بن سید محمد مقبول عالم تھے، وہ گجرات کے شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے، اور اپنے بھائی

سید جعفر بدر عالم کی سفارش سے اس عہدہ جلیلہ پر سرفراز ہوئے، اُن کا سلسلۂ نسب احمد آباد گجرات کے

مشہور بخاری خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ عالم سے ملتا ہے، نہایت لائق اور صاحب علم لوگون میں

سے تھے، اورنگ زیب عالمگیر سے لے کر محمد شاہ کے زمانہ تک شاہی کتب خانہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہا،

اس کے بعد اس کتب خانے کی جانب سے سلاطینِ مغلیہ بے پروائی برتنے لگے، جس کے سبب سے اکثر نوابیا فتہ

امرا نے کتب خانہ سے کتابیں منتقل کرنی شروع کردین، چنانچہ شاہ اودھ کے کتب خانہ میں بے شمار کتابیں

یہان کی موجود تھیں [1]،

۱۸۵۷ء کے بعد اس کتب خانے کے اجزا مختلف مقامات میں منتشر ہو گئے، اس کا کچھ حصہ رایل

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے قبضہ میں آیا، اور کچھ رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف لندن کی نذر ہوا،

بقیہ کتابیں لندن کے شاہی کتب خانہ میں داخل کی گئین، پھر بھی ہزارون کتابیں ایسی تھین، جو ہندوستان

ہی میں رہین، چنانچہ ہندوستان کے متعدد کتب خانون میں ایسی کتابیں میری نظر سے گذرین، جن پر شاہانِ مغلیہ

---

[1] تحفۃ العالم ص ۳۵۰

اور ناظم کتب خانہ کی مہرین موجود ہین،

اسی طرح بہت سے ذاتی کتب خانون مین بھی یہ کتابین پائی جاتی ہین،

عالمگیر کا کتب خانہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد مین اس کتب خانہ کو اور زیادہ ترقی ہوئی، اس وقت اس کا ناظم محمد صالح تھا، جو عیسیٰ خان ترخان (سندھ) کا دوسرا لڑکا ہے، اور مہتمم عنایت خان کا پوتا محمد منصور مقرر ہوا، اس کو مکرمت خان کا خطاب بادشاہ نے عطا فرمایا تھا، ۱۰۷۹ھ مین اس کے مہتمم سید علی الحسینی ہوئے، جیسا کہ ایک کتاب (قرآن شریف) کی مہر سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس وقت ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ مین موجود ہے[۱۵]،

قطب الملک کا کتب خانہ امراے دولت کو کتب خانون کا شوق تھا، اور اپنا ذاتی کتب خانہ خاص اہتمام سے رکھتے تھے، قطب الملک کا کتب خانہ انہی مین سے ایک تھا، اس کتب خانہ مین نادر کتابین بھی موجود تھین جن کو خاص طور پر وہ مہیا کرتا تھا،

توزک جہانگیری اس عہد مین بہت کمیاب تھی، لیکن اس نے اپنے کتب خانہ کے لئے اس کو بہم پہنچایا، پھر اسی کتب خانہ سے شاہزادہ محمد سلطان بن عالمگیر نے اس کو حاصل کیا، یہ کتاب آج بھی خدا بخش خان لائبریری مین موجود ہے[۱۶]،

نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ ۱۱۵۰ھ مین دہلی کے ذی اثر امرا مین شمار کئے جاتے تھے، اس زمانہ کے علمی ذوق کے مطابق ان کے پاس ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا، جس مین کتابین خرید کر کے داخل کی جاتی تھین، چنانچہ ایک کتاب مہندس شاعر کا دیوان مصنفہ ۱۱۵۰ھ خرید کر کے کتب خانہ مین داخل کیا گیا، شاعر مہندس کا اصلی نام لطف اللہ ہے، جس کا باپ نادر العصر استاذ احمد معمار عہد شاہجہانی کا مشہور انجینیر ہے، جس نے تاج محل آگرہ، اور لال قلعہ دہلی تعمیر کیا،

۱۵ بحوالہ معارف جلد ۱۰ ص ۲۲ ۱۶ اورنٹیل لائبریری پٹنہ کی فہرست جلد اول ص ۲۴۴،

اس کتاب کے خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے:-

"بتاریخ بستم رمضان المبارک ۱۱۵۰ھ دیوان مہندس خرید شد بسرکار نواب ابراہیم خان بہادر"

اور ابتدا مین ہے،

"این کتاب سرکار نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ بکتاب خانہ داخل شد"[۱۷]

نواب لوہارو کا کتب خانہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور مین نواب لوہارو بہت با مذاق اور علم دوست رئیس تھے، عموماً ان کے دربار مین اہل علم جمع رہتے، دہلی کے مشہور شاعر غالب سے ان کی بڑی دوستی تھی، نواب صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، نواب صاحب کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس مین مختلف فنون کی کتابین تھین، نوادر کا بڑا شوق تھا، اس لئے نقاشی اور مصوری کے بہترین نمونے اس مین تھے، بقول غالب کے اس مین کم از کم بیس ہزار کی مالیت کی کتابین تھین[۱۸]، افسوس ۱۸۵۷ء کی باد خزان نے کتب خانہ کا ورق الٹ دیا،

گجرات کا شاہی کتب خانہ گجرات مین ممکن ہے کہ کتب خانہ کا رواج اسلامی حکومت سے پہلے آباد شدہ مسلمانون مین ہو، جیسا کہ مولانا یعقوب الموجود ۶۱۵ھ کے قیام جامع مسجد ٹین سے معلوم ہوتا ہے لیکن تاریخ مین صریح طور پر اس کا کوئی ذکر نہین[۱۹]،

جب گجرات مین خود مختار حکومت قائم ہوئی، تو سلطان احمد متوفی ۸۴۶ھ کے دربار مین ہر قسم کے علوم و فنون کے ماہر جمع ہوگئے، اور ان لوگون کے فیض صحبت سے اس نے مدرسون، مسجدون ہزارون اور رفاہ عام کے دوسرے کامون کی بنیاد رکھی، ان مین کتب خانہ بھی تھا، اس کتب خانہ کا تذکرہ تاریخ مین اس طرح آتا ہے، کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے محمد شاہ متوفی ۸۵۵ھ نے شاہی کتبخانہ

۱۷ معارف نمبر ۱ جلد ۲۰ ۱۸ عود ہندی ص ۲۹، ۱۵۰

۱۹ خاتمہ مرآۃ احمدی مبئی ص ۳، ۶۲

سے کتابیں نکال کر مدرسۂ شیخ برہانی کے طلبہ پر پڑھنے کے لئے وقف کیں[۱]، یہ کتب خانہ ۹۰۰ھ تک قائم رہا،

اکبر نے جب گجرات فتح کیا، تو اس کی کتابیں کچھ تقسیم کر دیں، اس میں سے کچھ کتابیں شیخ عبدالحق محدث اور کچھ ملا عبدالقادر بدایونی اور فیضی کے حصہ میں آئیں، باقی شاہی کتب خانہ میں داخل ہوئیں[۲]،

عثمان پورہ کا کتب خانہ | شیخ محمد عثمان الملقب بہ شیخ برہانی، خلیفہ حضرت قطب عالم متوفی ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) بڑے پایہ کے بزرگ تھے، آپ نے سابرمتی ندی کے اس پار ایک گاؤں بسا کر اس کا نام عثمان پورہ رکھا، اسی میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ سلطان محمد شاہ گجراتی کے ذریعہ تعمیر کرایا، جس کا نام مدرسۂ شیخ برہانی تھا، اس مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، جس میں دوسری کتابوں کے علاوہ شاہی کتب خانہ کی وقف شدہ کتابیں بھی تھیں، ۸۶۸ھ تک تو وہ خود نگران رہے، اس کے بعد بھی عرصۂ دراز تک یہ سب یادگاریں قائم رہیں، پھر مرہٹوں کی لوٹ مار میں تباہ ہو گئیں، اب صرف مسجد اور مقبرہ یادگار باقی ہے،

خانقاہ سرخیز کا کتب خانہ | حضرت شیخ احمد کھٹوی متوفی ۸۴۹ھ نے سرخیز (احمد آباد) میں مسجد، تالاب اور خانقاہ خود تعمیر کرائی، آپ کے بعد سلطان محمد شاہ گجراتی نے مقبرہ اور مدرسہ بنوایا، غالب گمان ہے کہ اس مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ ضرور ہو گا، لیکن ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ شیخ احمد اپنی خانقاہ میں ذاتی کتب خانہ بھی رکھتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر حدیث کی کتاب مصابیح، کو اپنے کتب خانہ سے نکال کر حاضرین میں سے ایک شخص کو ایک حدیث سنائی، جس نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا[۳]،

شاہ عالم کا کتب خانہ | گجرات (احمد آباد) کے مشہور بزرگ حضرت سید محمد شاہ عالم متوفی ۸۸۰ھ ایک باعمل عالم تھے، مطالعہ کتب کا آپ کو بڑا شوق تھا، کثرت مطالعہ کی بنا پر آپ کی دونوں ہاتھوں میں ٹیک لگانے سے نشان پڑ گئے تھے، آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں عام کتابوں کے علاوہ نایاب کتابیں بھی تھیں، چنانچہ مولانا صدر جہان جب آپ سے ملنے گئے تھے، تو آپ نے امام رازی کا

[۱] ظفر الوالہ ص ۳۰، لندن جلد اول ص ۵۔ [۲] تاریخ بدایونی جلد دوم ص ۲۰۲، کلکتہ۔ [۳] خاتمہ مراۃ احمدی ص ۹۴،

ایک ایسا نایاب نسخہ ان کو دکھایا جس کی خبر مولانا صدر جہان کو نہ تھی[۱]،

آپ کے جانشین بھی اس کو برابر ترقی دیتے رہے، سید جعفر بدر عالم متوفی ۱۱۳۰ھ کے وقت میں یہ کتب خانہ عروج پر تھا[۲]، آپ نے خود بھی سیکڑوں کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر داخل کتب خانہ کیں، ایک دورات کے وقت راستہ میں ایک سائل نے قرآن کا نسخہ طلب کیا، آپ نے کہا کہ آج کتب خانہ سے دیکھ لیں گے، اس نے کہا کہ جو آپ کے پاس اس وقت موجود ہے، وہ کیوں نہیں دیتے، آپ ہمیشہ اپنے ساتھ ایک قرآن مجید رکھتے تھے، مجبوراً وہی دیدیا، مرہٹوں کی یورش کے زمانہ میں ان کی لوٹ مار کے خوف سے آپ کی اولاد شہر پناہ کے اندر چلی آئی تھی جسکی بنا پر کتب خانہ کی کافی حفاظت نہ ہو سکی، جس سے آہستہ آہستہ کتب خانہ تباہ ہو گیا، لیکن کچھ بچی ہوئی کتابیں آج بھی اُن کے سجادہ نشین اولاد کے قبضہ میں ہیں،

نہر والہ پٹن کے مشہور و معروف محدث علامہ محمد بن طاہر پٹنی گجرات کے پاس بڑا نایاب کتب خانہ تھا، اس میں علامہ ممدوح نے عرب و عجم سے لا کر کتابیں جمع کی تھیں، جب تک اس خاندان میں علم باقی رہا محفوظ رہیں پھر آہستہ آہستہ کتابیں ضائع ہو گئیں، مگر اس کا کچھ حصہ اُن کے وارثوں کے پاس آج بھی موجود ہے، راقم الحروف نے اس کتب خانہ کو ۱۹۳۲ء میں جب دیکھا، تو اُس کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا، اگر یہی حال رہا تو کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی تلف ہو جائے گا، اس میں کتاب مجمع البحار کے ایک نسخہ کے متعلق بتایا گیا کہ وہ مصنف کے قلم کا ہے، مگر اس کی کوئی شہادت اندرونی نہ ملی، جو اس کی تصدیق کرتی،

شاہ وجیہ الدین کا کتب خانہ | علامہ شاہ وجیہ الدین گجراتی متوفی ۹۹۸ھ کی احمد آباد میں بڑی مقدس ہستی تھی، ۹۳۲ھ میں آپ نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جو آپ کی وفات کے بعد ۱۲۳۶ھ تک قائم رہا، اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، یہ کتب خانہ بہت بڑا تھا، اور ہر فن کی کتابیں اس میں موجود تھیں، بزرگوں کا بیان ہے کہ دو بڑے کمروں میں بے ترتیبی سے کتابیں بھری تھیں، لیکن جب خاندان میں علم کے

[۱] خاتمہ مراۃ احمدی ص ۹۳ [۲] خاتمہ مراۃ احمدی اردو ص ۶۱ لاہور،

فروان نذر ہے، تو کتابیں بھی ضائع گئیں، اس صدی کی ابتدا میں مولوی عبدالمنعم صاحب باعکز خطیب جامع مسجد بمبئی اور یوسف صاحب بی اے کھٹ کھٹے مرحوم (بمبئی)، بہت سی کتابیں اٹھا لے گئے، راقم الحروف نے ۱۹۳۱ء میں اس کتب خانہ کو دیکھا تو صرف چند صندوق کتابیں تھیں، لیکن اب وہاں کچھ نہیں ہے، کچھ کتابیں تو احباب کے نذر ہوئیں، اور کچھ دریائے سابرمتی میں بہہ گئیں، کچھ تھوڑی سی کتابیں ہمارے دوست پیر حسینی صاحب اور بڑا میاں صاحب موجودہ متولی درگاہ کے پاس ہیں،

مدرسہ پٹن کا کتب خانہ | ۱۰۹۲ھ میں بمقام نہروالہ پٹن (گجرات) میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا جس کا نام فیض صفا تھا، اس کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی، جس پر مندرجہ ذیل تاریخی شعر درج ہے،

بنا شد مدرسہ و مسجد پر فیض صفا — در ہزار و نود و، دو ز عنایاتِ خدا

اس مسجد میں ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، راقم الحروف نے ۱۹۳۱ء میں جب اس کو دیکھا ہے تو وہ نہایت بُرے حال میں تھا، نایاب کتابیں اس میں کم رہ گئی تھیں، تاہم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا،

مخدوم ابراہیم کا کتب خانہ | کاٹھیاواڑ میں کتیانہ ایک مشہور قصبہ ہے، ۹۹۰ھ میں یہاں ایک بڑا مدرسہ قائم ہوا تھا، اس کے بانی مخدوم شیخ ابراہیم بن سلیمان تھے، ان کی وفات ۱۰۲۱ھ میں ہوئی، ان کا مدرسہ پچھلی صدی تک قائم تھا، اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، مدرسہ بند ہو جانے کے بعد بھی یہ کتب خانہ عرصہ تک قائم رہا، راقم الحروف نے جب ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں اس کو دیکھا ہے تو متوسط درجہ کا کتب خانہ تھا جس میں قلمی کتابوں کے علاوہ مطبوعات بھی تھیں، متولی صاحب فرماتے تھے کہ اس میں سے بڑا حصہ جونا گڈھ والے اٹھالے گئے،

مدرسہ ہدایت بخش کا کتب خانہ | احمد آباد میں مولانا شیخ نور الدین یگانۂ روزگار عالم اور متقی صوفی تھے، فلسفہ، منطق، ریاضی کی تعلیم مولانا احمد بن سلیمان متوفی ۱۰۸۰ھ سے حاصل کی تھی، جو مخدوم شیخ ابراہیم بن سلیمان کے حقیقی بھائی تھے، ان کے لئے شیخ الاسلام نے ایک عمارت مدرسہ ہدایت بخش

کے نام سے تیار کرا دی تھی، اس کی تعمیر میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیے خرچ ہوئے تھے، ۱۱۱۱ھ میں مدرسہ کی عمارت، مسجد اور دار الاقامہ کی عمارتیں بن کر تیار ہوئیں[1]، اسی کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر فن کی کتابیں موجود تھیں، خواص کے سوا عوام بھی اس کتب خانہ سے فیضیاب ہوتے تھے، افسوس کہ مرہٹہ گردی میں یہ کتب خانہ تباہ ہو گیا، اس کی متعدد کتابیں کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ حیدرآباد میں موجود ہیں، محلہ والوں کی دیکھ بھال سے مسجد البتہ اب تک قائم ہے،

مدرسہ ولی اللہ کا کتب خانہ | احمد آباد میں تلیا پال کے متصل جو مسجد ہے اسی کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ تھا، ۱۱۵۰ھ میں مولانا عماد الدین اس کے ناظم تھے، اس کے متعلق ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں تقریباً ہر فن کی کتابیں موجود تھیں اور بہت سی فن کی منتخب کتابیں تھیں، مرہٹہ گردی میں اس مدرسہ اور کتب خانہ کا حال بھی ابتر ہو گیا، اس خاندان میں جب علمی چرچا کم ہو گیا، تو کتب خانہ کی حفاظت کا خیال بھی جاتا رہا، اہلِ خاندان نے شائقین کو خود بہت سی کتابیں دیدیں، کچھ کیڑوں کی تواضع میں صرف ہوئیں، غرض اس طرح تمام کتب خانہ منتشر ہو گیا، بقیہ کتابیں جو اس وقت موجود ہیں ان سے قیاس ہوتا ہے کہ کتب خانہ بہت بڑا اور گوہر نایاب کا بیش بہا خزانہ ہوگا، کیونکہ اس علمی خزانہ کے لُٹ جانے کے باوجود آج بھی اس میں بہت سی نایاب اور بیش بہا کتابیں موجود ہیں، جو احمد آباد کی درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں وقف کر دی گئی ہیں،

شیعہ بوہروں کا کتب خانہ | احمد آباد گیارہویں صدی ہجری کے وسط تک شیعہ اسماعیلی بوہروں کا مرکز رہا ہے، ان کا والی یا داعی یہیں رہتا تھا، اور ان کے مدارس بھی زیادہ تر یہیں قائم تھے، داعی کے زیر نگرانی ایک بڑا عالیشان کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر فن کی کتابیں تھیں، ۱۰۶۵ھ کے بعد یہ کتب خانہ جام نگر (کاٹھیاواڑ) میں تبدیل کر دیا گیا[2]، یہ کتب خانہ آج بھی داعی وقت سیدنا طاہر سیف الدین کی

[1] خاتمہ مرآۃ احمدی کلکتہ ص ۵۰ [2] موسم بہار جلد سوم صفدری بمبئی بیان سیدنا داؤد،

نگرانی مین بمقام سورت اچھی حالت مین ہے، قوم کے مخصوص علما اس سے فائدہ اٹھاتے ہین، [illegible] (دسوین صدی کے آخر مین یہان ایک اور کتب خانہ سلیمانی بوہرون کی طرف سے قائم کیا گیا تھا جس مین زیادہ تر مذہبی کتابین تھین، یہ کتب خانہ بھی آج تک اُن کے داعی کے پاس موجود ہے،

کھنبایت کے کتب خانے کھنبایت ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست ہے، اس زمانہ مین اس کی آبادی بارہ لاکھ تھی، اس لئے اس کے حکمران مومن خان اوّل کے وقت سے یہان ہمیشہ عربی، ایرانی اور ہندوستانی علما اور فضلار کا مجمع رہا، اور یہان متعدد کتب خانے موجود تھے، لیکن جب ریاست پر زوال آیا، تو یہ بھی شیرازہ بھی بکھر گیا، اور کتب خانہ برباد گیا،

کھنبایت کے بعض خاندانون مین اس کا بقیہ حصہ موجود ہے، چنانچہ سید غلام عباس محمد علی صاحب کے یہان ۱۹۲۱ء مین راقم الحروف نے اس کتب خانہ کی بعض کتابین دیکھین اس مین ایک قرآن پاک بھی بخط نستعلیق تھا، جسے لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دستِ مبارک کی تحریر سمجھ کر بڑی عزت کرتے تھے، محکمۂ قضاۃ کا بھی ایک کتب خانہ تھا، جو ضائع گیا، اور موجودہ قاضی صاحب کے پاس چند معمولی کتابین رہ گئی ہین،

ایک دوسرا کتب خانہ عبد اللطیف دیوان صاحب کا تھا، جس کو اُن کے وارث نہ سنبھال سکے، اور آخر مین وہ برباد ہو گیا، باقی کچھ کتابین ایک بقال نے قرض مین لے لین، اس بقال نے راقم الحروف کو یہ کتابین دکھائین، لیکن افسوس کہ ان مین کوئی کام کی کتاب نہ تھی، سب معمولی فارسی کی تھین،

احمد آباد کے محکمۂ قضاۃ کا کتب خانہ اسلامی عہد مین احمد آباد کے قاضی شہر کا درجہ بہت بلند ہوتا تھا، وہ پورے ضلع کے محکمۂ قضاۃ کا نگران بھی ہوتا تھا، اس لئے اس کے پاس کتب خانہ بھی ضروری تھا، چنانچہ احمد آباد کے قاضی شہر کے پاس اس وقت بھی ایک کتب خانہ موجود ہے، جو اسلامی سلطنت کے زمانہ سے عہدۂ قضاۃ کے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے، لیکن اولاد بے علم ہونے کے سبب سے اس کا بیشتر

حصہ ضائع گیا ہے، اب سنا ہے کہ کچھ حفاظت کا خیال پیدا ہوا ہے، اور کتابین صندوقون سے نکال کر الماریون مین رکھی گئی ہین،

راقم الحروف تین بار اس کو دیکھنے کے لئے گیا، لیکن نامعلوم مصالح کی بنا پر قاضی صاحب نے دیکھنے کی اجازت نہ دی، اور بہ لطائف الحیل ٹال دیا،

شیخ حضرمی کا کتب خانہ احمد آباد مین شیخ عبد القادر حضرمی متوفی ۱۰۳۸ھ ایک مشہور بزرگ گذرے ہین[1] ان کی تصنیفات مین سے النور السافر فی اعیان القرن العاشر بڑی مشہور کتاب ہے، خیال آتا ہے کہ سول اسپتال سے مشرق کو جو گلی گئی ہے، اس کے اختتام کے بعد محلہ جوہری باڑہ مین اُن کی قبر ہے، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا[2] لیکن اب بجز مقبرہ کچھ نہین ہے، شیخ عبد القادر بڑے مورخ، محدث اور صوفی تھے، اس لئے غالبًا تصوف، تاریخ اور حدیث کی کتابین اس مین زیادہ رہی ہونگی،

جانپانیر (گجرات) ایک زمانہ تک پایۂ تخت رہا ہے، سلطان محمود اوّل کے زمانہ مین مولانا نصر اللہ یہان کے قاضی شہر بڑے عالم اور متقی مانے جاتے، مشتبہ مال سے ہمیشہ بچتے تھے، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس کا تعلق محکمۂ قضاۃ سے تھا،

بھروچ کے محکمۂ قضاۃ کا کتب خانہ بھروچ (گجرات) مین بڑا قدیم شہر ہے، یونانی فوجین جب ہندوستان مین آئی تھین، اس وقت بھی یہ شہر موجود تھا، اسلامی عہد مین اپنے ضلع کا مرکز تھا، اس لئے یہان ہمیشہ قاضی کا محکمہ قائم رہا، آخری دور مین یہ عہدہ مولانا سید احمد شیرازی کے خاندان مین منتقل ہوا، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس کا بقیہ حصہ اب تک اُن کی اولاد مین موجود ہے،

۱۹۲۲ء مین راقم الحروف نے اس کو دیکھا تھا، اب بھی اس مین بعض نایاب قلمی کتابین موجود ہین، قاضی نور الدین صاحب فرماتے تھے[3]، کہ مین خورد سال تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا، اس لئے میری ہوش

---

[1] خلاصة الاثر جلد ثانی ص ۴۴۰ [2] یاد ایام ص ۴۰، علی گڑھ [3] قاضی صاحب موصوف اسی خاندان کے

سنبھالنے تک اس کتب خانہ کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا، اس کتب خانہ کی حسب ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں

مثنوی مولوی، دوم مکتوبہ ۱۰۹۱ھ جلد پنجم بہر طرز سے ایڈٹ کی ہوئی مجموعہ سرخسی جلد ثانی مکتوبہ ۸۵۰ھ حدیث میں کتاب الخازن المعروف بعوز جدید، جلد ثانی، کتاب الخلاصہ فی الفتاوی مولفہ طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری، مجمع البحرین، ترجمہ اپن کھت، پدم ہنس از اتھرن وید وغیرہ،

شیخ مہائمی کا کتب خانہ شیخ علاء الدین علی بن احمد مہائم (بمبئی) کے رہنے والے تھے، ۸۳۵ھ میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے[۱]، اُن کا مقبرہ آج تک زیارت گاہ خلائق ہے، شیخ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم صوفی اور بہت سی مفید کتابوں کے مصنف تھے،

آپ کے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، جو عرصہ تک قائم رہا، لیکن پھر متولیوں کی بے توجہی سے کتب خانہ ضائع ہو گیا، ۱۹۳۳ء میں جب راقم الحروف وہاں گیا، تو دیکھا کہ ایک جدید کتب خانہ درگاہ شریف میں قائم ہے، جس میں عربی فارسی، اردو کی کتابیں تھیں، ناظم کتب خانہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا، کہ قدیم کتب خانہ کی بقیہ کتابیں اسی میں شامل کر دی گئی ہیں، یاد آتا ہے کہ شیخ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب مجھے دکھائی گئی تھی، لیکن عجلت کے باعث میں اس کو نوٹ نہ کر سکا،

سورت کے نواب صاحب کا کتب خانہ سورت کے نواب صاحب کے پاس بھی ایک کتب خانہ قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے، غالباً سورت کا سکھری کتب خانہ ہے جو وراثت میں نواب صاحب کو ملا ہے، راقم الحروف اس کو دیکھنے کے لئے دو بار گیا، لیکن نواب صاحب سورت سے باہر تشریف لے گئے تھے، اس لئے ناکامیاب رہا،

خاندان عیدروس کا کتب خانہ سورت کے شرفا میں عیدروس صاحب کا خاندان مشہور خاندان ہے، خاندان

(بقیہ حاشیہ ۱۹۵) ممتاز فرد ہیں اور فی الحال (سنیے) بانی عہدہ (قضاۃ) پر مامور ہیں، علمی ذوق بھی رکھتے ہیں،

سلطان محمود بن لطیف خان کے عہد ۹۵۵ھ میں حضرموت سے احمد آباد آیا، پھر اُن کے لڑکے بھڑوچ میں اور پھر سورت میں ۹۸۵ھ میں وارد ہوئے، "جاء الجواد الشیاخ" اس آمد کی تاریخ ہے[۱]،

یہ خاندان ہمیشہ سے صاحبِ علم رہا ہے، اور اس نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رکھا، اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جو سلسلہ بہ سلسلہ اس وقت تک خاندان میں چلا آرہا ہے، ۱۹۳۲ء میں راقم الحروف نے اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، اب بھی بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، حدیث، تصوف، ادب، تاریخ کی کتابیں زیادہ ہیں

سید قمر الدین کا کتب خانہ سورت ہی میں ایک اور کتب خانہ سید قمر الدین مرحوم کا ہے، ضائع ہوتے ہوتے جس کی اب تین الماریاں رہ گئی ہیں، راقم الحروف ۱۹۳۲ء میں اس کو دیکھنے گیا، تو اس وقت گھر میں کوئی مرد نہ تھا، پردہ کرا کے اس کتب خانہ کی سیر کی،

افسوس ہے کہ اس میں کوئی نایاب کتاب نہ ملی، صرف ایک کتاب جس کا نام اللہ خدائی ہے، قابلِ ذکر نظر آئی، یہ خالق باری کے طرز کی تھی،

اس کے دو ابتدائی شعر یہ ہیں،

ہے حمد پاک اور احد کہہ	جان ام القری کو تو مکہ
اب، پدر، باپ، والدہ مائی	جست اقوی برادر ابھائی

یہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں بمقام بمبئی اسمٰعیل شیرازی کے ذریعہ طبع ہوئی ہے،

دوسری کتاب "کلام اقدس" ہے، اس کے مصنف حضرت پیر محمد شاہ بیجاپوری ہیں، جو چالیس برس تک احمد آباد کی جامع مسجد میں معتکف رہے، یہ شاعر بھی تھے، تخلص "اقدس" تھا، اردو کے مشہور شاعر ولی گجراتی کے ہمعصر تھے، متعدد نظمیں اردو میں لکھی ہیں، ان کا دیوان بہت نایاب ہے، راقم الحروف نے

[۱] کتاب مزارات سورت و بھڑوچ مؤلفہ عبد الحکیم متوفی ۱۲۶۰ھ قلمی کتب خانہ عیدروس سورت،

ایک مکمل نسخہ احمد آباد میں دیکھا ہے، اور یہ دوسرا نسخہ ہے، یہ دیوان ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، معتقدین اس کو آنکھوں سے لگاتے ہیں، مگر طبع کرنے کے خلاف ہیں،

خانقاہ شاہ عبد العلیم کا کتب خانہ

بھروچ سے متصل ایک قصبہ انکلیشور ہے، یہاں شاہ عبد العلیم صاحب کی خانقاہ اور درگاہ و مسجد ہے، یہاں بھی قدیم زمانہ میں بڑا کتب خانہ تھا، اور چونکہ سورت کے راستہ میں پڑتا تھا، اور قافلوں کا پڑاؤ یہاں ہوتا تھا، اس لئے یہ قصبہ بڑا آباد ہو گیا تھا، اہل علم اس کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتے تھے، اب یادگار کے طور پر تھوڑی سی کتابیں رہ گئی ہیں،

میسور کا شاہی کتب خانہ

مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانہ میں جب میسور میں نواب حیدر علی نے اپنی خود مختار سلطنت قائم کی، تو یہاں بھی شمع علم کے پروانے ادھر ادھر سے آکر جمع ہونے لگے، پھر ٹیپو سلطان کی قدردانی سے میسور میں اہلِ کمال کا بڑا گروہ جمع کر لیا، جو افسوس ہے کہ اس کے بعد پھر کبھی نظر نہ آیا، ٹیپو سلطان کے پاس جو صاحبِ علم خصوصاً اہلِ کمال پہنچا تو وہ اپنی جوہر شناسی سے اس کو اسی کام میں لگا دیتا، جس کا وہ اہل ہوتا، چنانچہ اس نے کسی کو محکمۂ جنگ میں کسی توپ خانہ اور کسی کو بحری بیڑہ میں جگہ دی، اسی طرح علماء میں سے کسی کو تعلیم، کسی کو تصنیف اور کسی کو ترجمہ پر مقرر کیا تھا۔

اس نے ایک یونیورسٹی بھی قائم کی تھی، جس کے ماتحت مختلف علوم و فنون کے شعبے کھولے جا رہے تھے، اس سے متعلق ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا، جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں تھیں، ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) میں جب سلطان شہید ہوا، اور سرنگا پٹن پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، تو قلعہ اور محلات شاہی کے ساتھ کتب خانہ بھی انگریزوں کے قبضہ میں آگیا، اور قصر شاہی کی دوسری چیزوں کی طرح کتب خانہ بھی تاراج ہو گیا، اس لوٹ کے بعد جو کتابیں بچیں وہ چھ سال تک کس مپرسی کی عالم میں پڑی رہیں، اس کتب خانہ کی کتابیں کچھ تو رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، اور باقی

لندن روانہ کر دی گئیں،

۱۸۰۹ء میں میجر اسٹورٹ نے ان باقی ماندہ کتابوں کی جو فہرست شائع کی تھی، اس میں فنون کے لحاظ سے کتابوں کی تعداد مندرجہ ذیل تھی،

قرآن مجید	۴۴	ریاضی	۷	حدیث	۴۲
تصوف	۵۶	ہندی نظم	۲۳	آرٹس	۱۹
نجوم	۴۰	وظائف	۳۵	زبان	۴۵
نظم	۱۹	فقہ	۹۵	ترکی	۲
تفسیر	۴۱	طب	۶۲	الٰہیات	۴۶
اخلاق	۲۴	دکھنی	۴	فلسفہ	۵۴
قصص	۱۸	لغات	۲۹		

رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں جتنی کتابیں داخل ہوئیں، ان میں سے مخصوص کتابیں یہ تھیں،

رسالہ پدکھا	روز نامچہ وکلائے حیدر آباد
منتخب ضوابط سلطانی	اتالیق شاہزادہ
رسالہ کچہری	مجموعہ سندات
ضابطہ اشال	حکمنامہ
راہِ فتن و سوار	فرمان
فتح المجاہدین	فرامین کا مجموعہ
وقائع منازل	

صرف اردو زبان کی کتابیں انڈیا آفس لندن میں جو داخل کی گئیں، اُن میں سے مخصوص نایاب کتابیں مندرجہ ذیل ہیں،

تذکرہ شعرائے ہندی	مؤلفہ فتح علی حسین خان	قصہ ماہ پیکر	......
علی نامہ	" ملا نصرتی	قصہ بہرام و گل اندام (مکرر)	طبعی مکتوبہ [illegible]
گلشن عشق	"	دیوان رفیع سودا،	مرزا سودا
کلیات قطب شاہ	" قطب شاہ	قصائد رفیع سودا	"
روح افزا (قصہ رضوان شاہ)	" فائز	سری گنیش	ترجمہ سنسکرت
قصہ ماہ پیکر	"	سندر سنگھار ہندی	"
قصہ بہرام و گل اندام	" طبعی گول کنڈوی	دھوری ہندی	شاہ درویش گجراتی نقوتن
پھول بن	" ابن نشاطی	روضۃ الشہداء	سیوا گل برگوی
طوطی نامہ	"	رسالہ سرود و راگ یعنی }	......
قصہ پدماوت دکھنی	"	مجموعہ قدیم دکھنی غزلیات }	
قصہ لعل و گہر	" عارف الدین خان عاجز	نشاط العشق شرح غوثیہ	ترجمہ
دیوان یقین	" انعام اللہ خان یقین	ترجمہ مفتاح الصلوٰۃ	فتح محمد برہان پوری
بھوگ بل	" مترجمہ شہاب الدین	خلاصہ سلطانی	سید امام الدین و محمد صمد قاضی
مفرح القلوب	" حسین علی،	سرنگا پٹن،	
قصہ رضوان شاہ	مؤلفہ فائز	کلید زبان ملنگی،	......

اسی طرح ونڈسر کیسل کے کتب خانہ میں قرآن مجید کا وہ نسخہ بھی موجود ہے، جو خاص شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، بہترین خط نسخ میں اعلیٰ نقش و نگار سے مزین ہے،

کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت نوے ہزار تک آنکی گئی ہے، یہ نسخہ بھی اسی ٹیپو سلطان کے کتب خانہ کی نادر چیز تھی،[۱]

مدرسہ عربیہ خانقاہ کا کتب خانہ صوبہ بہار میں سہسرام مشہور جگہ ہے، جس کو شیر شاہ کی ولادت گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے، یہاں بارھویں صدی کی ابتدا میں ایک بزرگ شاہ کبیر درویش رہتے تھے، ۱۱۲۹ھ میں فرخ سیر بادشاہ نے ایک لاکھ درہم آمدنی کے اٹھارہ موضع شاہ صاحب کو نذر کئے جن پر ان کے جانشین شاہ خلیل اللہ صاحب نے قبضہ کیا، اس کے بعد ۱۱۸۵ھ میں شاہ عالم ثانی نے بھی (۱۴) مواضعات التمغا کے طور پر عنایت کئے،[۲]

اس خانقاہ کے متعلق ایک مدرسہ بھی قائم ہوا تھا، جو آج تک موجود ہے، مدرسہ کا نام مدرسہ عربیہ خانقاہ ہے،[۳] غالباً خانقاہ کی بنیاد ہی سے اس میں کتب خانہ قائم کیا گیا ہوگا، جیسا کہ عام طور سے دوسری خانقاہوں میں دستور تھا، لیکن مدرسہ عربیہ کے قیام کے بعد اس کا تعلق مدرسے سے کر دیا گیا، یہ کتب خانہ بہت بڑا اور بہت بیش قیمت تھا، اس کی قیمت کا اندازہ تقریباً ایک لاکھ کیا جاتا ہے، غالباً مدرسہ کے ساتھ یہ کتب خانہ آج بھی موجود ہے،

راجہ شتاب رائے کا کتب خانہ سلطنت مغلیہ کے آخر زمانہ میں پٹنہ (بہار) کا ناظم شتاب رائے تھا، جو علوم و فنون کا مربی، اور اہل علم کا بڑا قدردان تھا، اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا راجہ کلیان سنگھ ناظم ہوا، یہ خود کئی کتابوں کا مصنف اور شاعر تھا، اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں زیادہ تر فارسی ادب کی اور کچھ تاریخ کی کتابیں تھیں، زمانہ کے ساتھ ساتھ جس طرح اس کی اولاد فارسی سے نابلد ہوتی گئی، اسی طرح آہستہ آہستہ کتب خانہ بھی غفلت کی نذر ہوتا گیا،

ابھی چند سال ہوئے ایک نمائش کے موقع پر چند اہل علم نے اس خاندان کے ایک معزز ممبر

---

[۱] تاریخ میسور ص ۲۵۵ مطبوعہ بنگلور [۲] تاریخ سہسرام ص ۹، مطبوعہ دیوبند [۳] تاریخ مذکور ص ۸۲،

سے اس کتب خانہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، انھون نے ازراہِ لطف و کرم کتابین دکھائین جو صندوقون مین ردی کاغذون کی طرح بھری ہوئی تھین، فی الحال اُس مین کوئی نایاب نسخہ دستیاب نہ ہوا،

راجہ رام نرائن کا کتب خانہ

اسی طرح راجہ رام نرائن کے پاس بھی جو شتاب راے سے پہلے وہان کا دیوان تھا، ایک کتب خانہ تھا جس کی کتابین اُس کے اخلاف کے پاس اب تک موجود ہین؛

صادق پور پٹنہ کے کتبخانے

اس کے علاوہ مولوی احمد اللہ صاحب بن مولوی الٰہی بخش صاحب جعفری، اور مولوی ولایت علی صاحب بن حکیم ارادت حسین صاحب محلہ صادق پور پٹنہ مین بڑے صاحب علم اصحاب تھے، ان کے پاس بھی اپنا ذاتی کتب خانہ تھا، غدر ۱۸۵۷ء مین حکومت نے انکی تمام جائداد و املاک ضبط کرلی، اسی مین کتب خانہ بھی تھا، اس طرح اس کتب خانہ کا بڑا حصہ تو لندن پہنچ گیا، اور کچھ خدا بخش خان کی لائبریری مین آج بھی موجود ہے، بعض کتابین ان کے اعزہ کے پاس بھی ہین، مثلاً شمس العلوم، علم لغت مین تبرکاً اس خاندان مین چلی آرہی ہے، عظیم آباد کے محلہ دیوان منکوہ، حاجی گنج، شادی منزل، ٹیڑھی گھاٹ، دھول پورہ وغیرہ مین اکثر امرا کے پاس ذاتی کتب خانے موجود تھے، جیسا کہ عظیم آباد کے بزرگون سے معلوم ہوا، لیکن اسلاف کے علمی شوق کی اخلاف نے کوئی قدر نہ کی، کتابین ضائع ہوگئین، یا بُرے حال مین ہین،

خانقاہ عباسی کا کتب خانہ

صوبہ بہار مین بھاگل پور کی خانقاہ عباسی محلہ مشہور خانقاہ ہے، یہان بھی ایک کتب خانہ تھا، اسی طرح پھلواری شریف کی خانقاہ بھی قدیم ہے، اور ہمیشہ سے ارباب علم و فضل کا مرکز رہی ہے، اور آج تک یہان رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہے، یہان بھی کتبخانہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، (باقی)

علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب

(۳)

اب تک جو کچھ کہا گیا، اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا، کہ حسن و عشق کی اخلاقی اور روحانی عظمت، بلندی اور پاکیزگی کا احساس جو ایک باکمال غزل گو شاعر کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور مقدم شرط ہے، اسکا اثر علامہ مرحوم کے مذاق تغزل مین نمایان طور پر نظر آتا ہے، حسن سے نیاز و عقیدت کا اظہار عشق کا اولین فریضہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ بلند حوصلگی، عزت نفس، اور خودداری کی شان بھی قائم رکھنا اس کے لئے ضروری ہے، لیکن یہ شان بھی اتنی بلند نہ کی جائے، کہ بارگاہ حسن کی ادب شناسی جاتی رہے، اور نہ اظہارِ عقیدت مین اس حد تک غلو سے کام لیا جائے، کہ ایک رسوائے سر بازار کی مبتذل ادائین نظر آنے لگین، راہِ طلب کا یہ نہایت نازک مرحلہ ہے، جس سے صرف وہی صاحبِ ذوق عہدہ برآ ہوسکتا ہے جس کو علامہ مرحوم کا سا نکتہ سنج دماغ قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہو،

اس سلسلہ مین ہم چند مثالین اور پیش کرنا چاہتے ہین، جن سے علامہ کی نکتہ سنجی اور لطافت خیال کا کافی طور پر اندازہ ہوگا،

عشق کا تعلق دراصل دل سے ہے، اس لئے سب سے پہلے اس آئینے کو علم و دانش کے زنگ سے پاک کرنا چاہئے، ورنہ محبت کی روح پرور کیفیتون کا جلوہ نظر نہین آسکتا، اور نہ ایسا زنگ آلود

دل محبوب کے فیضانِ جمال کا مستحق ہو سکتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں جہل و لاعلمی ہی کا دامن پھیلا کر خانقاہ
و امراء کے گہر ہائے آبدار کی دولت حاصل کی جا سکتی ہے، علم و حکمت کے غرور کو عشق کی بزم خاص میں بار
نہیں مل سکتا، اس لئے علامہ کے نزدیک اس داغ کا مٹانا ضروری ہے

دل کہ زنگ آلودِ دانش شد سزائے عشق نیست   اول این آئینہ را پرداز می بایست کرد

اسی خیال کو ایک دوسرے پُرلطف انداز سے اس شعر میں ادا کیا ہے،

ترکِ دانش کردم و نادان شدم   این دلیلِ آن کہ دانا بودہ ام

یہ صرف شاعری نہیں ہے، بلکہ ایک لطیف حقیقت ہے جس کو بزم سلوک کے محرمان خاص بخوبی
سمجھ سکتے ہیں، درس گاہ محبت کچھ عجیب مقام ہے، اس کے اصول و آئین ہی کچھ اور ہیں، یہاں سب سے
پہلے ترک دانش ہی کی تعلیم ہوتی ہے، کہ بغیر اس کے اصل دانائی کے جلووں سے چشم باطن روشن نہیں ہو سکتی
لیکن نادان ہونے کے لئے بھی دانائی درکار ہے، ہر شخص میں اتنی بصیرت کہاں ہوتی ہے کہ وہ اس راز
کو سمجھ سکے، کہ جب تک صفحۂ دل سادہ اور ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا نہ ہوگا، اس پر طغرائے محبت کے
نقوش ابدی ثبت نہیں ہو سکتے، اس لئے علامہ نے اپنے دانا ہونے کی جو دلیل پیش کی ہے، اس کی
صحت اہل نظر کے نزدیک ناقابلِ انکار ہے، لیکن اس دورِ مادیت میں اب اس قسم کے دانا کہاں نظر
آتے ہیں، اور ہوں بھی تو اُن کا قدرشناس کون ہے ؟

زندگی دراصل روح کے اندرونی سوز و گداز کا نام ہے، بازارِ محبت میں صرف اسی متاع
گران قدر کی پرسش ہوتی ہے، محض ظاہری آب و رنگ کی کوئی قیمت نہیں،

رو کردہ متاعے است بہ بازارِ محبت   آن داغ کہ از لالہ تر او جگر افتاد

کیونکہ صرف اس لئے کہ وہ داغِ زندگی کے سوز سے خالی ہے، عشق کا یہی وہ سوز و گداز ہے جس
کی بدولت انسان کو عالم کائنات کا تاجِ سلطانی عطا ہوا تھا اور جس کے بغیر وہ دیگر مخلوقات

کسی طرح اپنی فضیلت کا دعویٰ نہیں کر سکتا،

انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کو محبوب ہوتی ہے، اسی کے خیال میں وہ ہر وقت محو رہتا ہے،
اور کوئی دوسرا ذکر خواہ کتنا ہی دلآویز کیوں نہ ہو، اس کے اس عالم محویت میں خلل انداز نہیں ہو سکتا،
شدت محبت کا تقاضا بھی یہی ہے جس کو علامہ نے اس طرح ادا کیا ہے،

حدیثِ خلد چہ گویند با منِ مجنون   گمان برم کہ مگر گوشۂ ز صحرا ہست

محبوب کی بارگاہ میں پیغام رسانی کے لئے عام طور پر نامہ و قاصد سے کام لیا جاتا ہے، لیکن
علامہ کے ذوقِ بلند کو یہ بارِ احسان گوارا نہیں، وہ یہ کام خود اپنے جذبِ دل سے لینا چاہتے ہیں،

نامہ و قاصد حریفِ آن بتِ خودکام نیست   خود ترا اے جذبِ دل این کار می بایست کرد

جذبۂ عشق کی شانِ کشش تو یہی ہے، البتہ اہلِ ہوس کو یہ حوصلہ نصیب نہیں ہو سکتا،

محبوب کی بے اعتنائی کا شکوہ ایک عام مذاق ہے، لیکن اس پر نظر نہیں جاتی، کہ خود دل کی
وارفتگی ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کی نگاہ مست غافل نہیں ہے، بلکہ یہ اسی کا فیضِ التفات
ہے، جس سے علامہ کی نکتہ سنج نگاہ باخبر ہے،

خود پے توان بر وز وارفتگیِ دل   کان نرگسِ مستانہ بما نیز سرے داشت

ہجر و فراق کا تخیل بے شبہ ان لوگوں کے لئے موجبِ آزار ہو سکتا ہے، جن کو صرف محبوب کے
خال و خط کے مشاہدۂ جمال کی آرزو ہوتی ہے، لیکن اگر محبوب کے خیال اور یاد میں بھی ذوق و لذت
کا سامان ہے، اور یقیناً ہے تو پھر احساس فراق کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ ہر حالت میں اور ہر جگہ
دوست کی معیت محسوس ہوگی، لیکن خیالِ دوست میں اس طرح خود وارفتہ ہونا کہ یہ محسوس ہو کہ
دوست ہر وقت پاس ہے، ہر دل کا کام نہیں ہو سکتا، اس کے لئے علامہ ایسے نکتہ دانِ محبت کا
قابل دل درکار ہے، جو فراق کی کیفیت سے ناآشنا ہے،

باخیالش بسکہ بودم ہمنشین گوئیا با دوست ہرجا بودہ ام

کیا عام غزل گو شعراء جن کے دل شکن نالہ ہائے شب فراق نے عشق کی بزم سرور کو مجلس عزا بنا رکھا ہے، اپنے ذوق کو اب اتنا بلند کر سکتے ہیں، کہ خیال محبوب کی ہم نشینی سے سکون روحانی کی نعمت بے بہا حاصل کر سکیں ؟

عشاق کو عام طور پر محبوب سے مجبوری کی شکایت رہتی ہے، لیکن علامہ کے نزدیک عاشق خود اس مجبوری کا ذمہ دار ہے، دراصل محبوب کی کوئی خطا نہیں،

مجوریم ز دولت وصلت ہم از من ست تو بس قریب بودی و ما دور بودہ ایم

غور کرو، محبوب کی قربت کی خواہش کس نے کی ؟ ظاہر ہے یہ عاشق ہی کی آرزو تھی، لیکن اس قرب کا نتیجہ کیا ہوا ؟ برق جمال کی شدت تابانی نے نہ صرف نگاہوں کو خیرہ کر دیا، بلکہ ہوش و حواس بھی گم کردئے، ایسی حالت میں دولت وصل سے عاشق کیونکر بہرہ مند ہو سکتا ہے ؟ یہ قرب کیا ہوا کہ اور بھی دوری ہو گئی، آفتاب کے جلووں سے نگاہ دور ہی رہ کر اکتساب فیض کر سکتی ہے، لیکن افسوس ہو کہ طالبان وصل اب تک اس حقیقت سے بے خبر ہیں،

شاہراہ سے الگ ہو کر چلنا بظاہر بے راہروی معلوم ہوتی ہے، لیکن علامہ کی نگاہ میں یہ دراصل بے راہروی نہیں ہے، اس لئے کہ عوام کے جادہ ہائے غلط نے شاہراہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے،

از بسکہ جادہ ہای غلط شاہ راہ گشت بے راہہ رفتنم ز طریق خطا نبود

ظاہر ہے کہ ایسی شاہراہ سے الگ ہو کر چلنے والے پر بے راہروی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس پر چلنا ہی غلطی اور گمراہی کی دلیل ہے، اس لئے کہ اس پر چل کر دیدہ بینا کو حقیقت کا نظارۂ جمال نصیب نہیں ہو سکتا، لیکن اس بے راہروی کی جرأت صرف ایک بلند حوصلہ اور عالی نظر انسان ہی کے گام طلب کو ہو سکتی ہے،

عشق کے معرکہ میں صرف اسی کا نام باقی رہ جاتا ہے جو اپنی ہستی کو مٹا کر بے نام و نشان ہو جاتا ہو، اس حقیقت کو دیکھو علامہ نے کس سادہ طریقہ سے بیان کیا ہے فرماتے ہیں :-

دانی کہ درین معرکہ با نام و نشان کیست؟ آنست، کہ از نام و نشا نقش اثر نیست

برہمن طعنہ زن ہے کہ مسلم کا ایمان تقلیدی ہے، علامہ کی طبع نکتہ سنج نے اس کا یہ جواب دیا ہے!

ایمان ما اگرچہ بہ تقلید بودہ است طعنم مزن کہ کفر تو ہم اجتہادی نیست،

غور کیا جائے تو واقعہ بھی یہی ہے،

جس ذوق و شوق کے ساتھ علامہ جمال محبوب کا نظارہ کرتے ہیں اس کی محویت کا یہ عالم ہو کہ خود نظر لذت دیدار سے بے خبر رہ جاتی ہے، فرماتے ہیں،

آنقدر محو تماشاے جمالش بودم کہ نگہ را خبر از لذت دیدار نماند

اور کبھی ذوق تماشا اس حد تک بڑھ جاتا ہے، کہ خود جمال محبوب سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے،

از جمالش ہم نہ بردم بہرۂ آن قدر محو تماشا بودہ ام

یہ پر کیف طرز دید ہر نگاہ کو نصیب نہیں ہوتا، اس کا بہت کچھ تعلق دیکھنے والے کی روحانی استعداد سے ہے،

غرض محبوب کے سراپاے جمال سے علامہ کی چشم و نگاہ کو جو شیفتگی ہے، اس کا ایک اور پر کیف عالم ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں،

بر سراپاے جمال تو نگاہم گوئی رہروے ہست کہ از ضعف بہ ہر جا ماند

اس ندرت تشبیہ کی مثال کہیں اور مشکل سے مل سکتی ہے، نفس خیال یعنی عاشق کی غایت شیفتگی کو پیش نظر رکھ کر غور کرو کہ یہ کیفیت اس تشبیہ کے ذریعہ سے کس خوبی کے ساتھ ادا ہوئی ہے تشبیہات بھی پیرایۂ بیان کو موثر اور دلکش بنانے میں بہت زیادہ معین ہوتی ہیں، بشرطیکہ وہ دور از کار اور

خارج از قیاس نہ ہوں،

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں علامہ کو قدرت کی طرف سے ایک نہایت رنگین شگفتہ، پرکیف اور دلوانگیز طبیعت عطا ہوئی تھی، اس لئے اُن کے کلام میں ایک خاص جوش مستی کا عالم نظر آتا ہے جس کی مثال بجز خواجہ حافظ کے اور کسی فارسی غزلگو شاعر کے کلام میں مشکل سے مل سکتی ہے، یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے جس کا اندازہ مثالوں سے ہو سکتا ہے،

یک سر و صد گونہ سودا در نہانے داشتم   یاد آن روزے کہ من با خود جہانے داشتم

یاد آن روزے کہ دور از ماجراہای جہان   ماجرائے با نگار نکتہ دانے داشتم

یاد آن روزے کہ دست افشان گذشتم از حرم   از غرورے آن کہ من ہم آستانے داشتم

ہیچ باک از گردش گردون گردانم نبود   گرز بن کوچہ او آسمانے داشتم

خلیل آہنگ طرح کعبۂ اسلامیان دارد   بہ دست آوردہ ام من نیز خاک آستانے را

ما از بلند و پست جہان درگذشتہ ایم   از بسکہ دیدہ ایم نشیب و فراز را

بگذار اے ابر دعوی کہ ہنوزم مژہ   نم اشکے ست کہ آبستن طوفانے ہست

وسعت حوصلۂ سعی عمل بین کہ ہنوز   کف خاکم بہوائے سر دامانے ہست

برق عشقے کہ مرا بر دل و بر تن زدہ بود   این ہمان ست کہ بر وادی ایمن زدہ بود

تا ازین مردہ بہ جان کہ خطر خواہد بود   دوش پیمانہ مے بر سر پیمان زدہ ام

از پریشانی ایام میندیش کہ من   دست در حلقۂ آن زلف پریشان زدہ ام

کام افتادہ بہ آن بادشہ کشور حسن   دست رد بر حشم قیصر و خاقان زدہ ام

کس چہ داند کہ بہ خلوت گہ آن ماہ تمام   زدہ ام ساغر و بر یاد حریفان زدہ ام

صد دکان لعل و گہر چیدہ ام اکنون زین پس   طعنہ بر بے سر و سامانی عمان زدہ ام

سالہا گوش جہان زمزمہ زا خواہد بود   زین نواہا کہ درین گنبد گردان زدہ ام

بے شبہہ یہ جوش نغموں کی صدائیں کبھی خاموش نہیں ہوتیں، وہ ہمیشہ فضائے آسمانی میں گونجتی رہتی ہیں، اس لئے کہ اُن میں زندگی کی روح پنہاں ہوتی ہے،

دو شعر اور ملاحظہ ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ علامہ کے قلب و روح میں کس قیامت کا جوش و خروش تھا، اور ان کا ذوق مستی کس حد تک تند و قوی واقع ہوا تھا،

غنچۂ شگفتہ جنون تاختن آورد ہمی   تا دگر از اثر باد بہاری چہ شود

ما بندۂ آن بادہ تندیم کہ از جوش   از شیشہ بروں جست و زمینا بدر افتد

ان اشعار کی داد تو صرف خواجہ حافظ کی روح دے سکتی ہے،

رندی و سرمستی اور زہد و پارسائی پر طعن و طنز کے مضامین، لوازم شاعری میں ہیں، خصوصاً خواجہ حافظ جن کا رنگ علامہ کے کلام میں زیادہ نمایاں ہے، اس فن کے امام تھے، اس لئے علامہ کی شاعری میں بھی اس بادۂ سرجوش کا بڑا اثر ہے اور انھوں نے جس جوش کے ساتھ مستی و رندانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے محبوب سے ان کا یہ مطالبہ

مہ از دست خود رنگین نوائے چو شبلی را   تو شاہ حسنی و در کار داری یک غزلخوان ہم

کچھ ناموزوں اور بیجا نہیں ہے،

اُن کے نزدیک اگر عیش و نشاط کی فراوانی مطلوب ہے تو سب سے پہلے عقل کو شہر بدر کرنا چاہئے کہ رندوں کی بزم سرور میں اس دیوانہ لایعقل کے پند و وعظ کا کوئی کام نہیں،

خواہید اگر کہ عیش و نشاط فزون کنید   دیوانہ ایست عقل ز شہرش برون کنید

غور کرو مذاق رندانہ کا یہ کتنا صحیح اور جائز مطالبہ ہے !

زندگی کی لذتیں دراصل عشق و محبت ہی کی ہنگامہ آرائیوں سے وابستہ ہیں، چنانچہ علامہ کو اس مقام پر افسوس ہے جہاں ان جذبات کو مشتعل کرنے والا کوئی فتنہ گر نہ ہو،

نے ذوق نگاہے نہ ہنگامۂ عشقے، اے وائے بشہرے کہ درو فتنہ گرے نیست

ترکِ عاشقی بظاہر کوئی قابلِ اعتراض فعل معلوم نہیں ہوتا، لیکن علامہ کی نکتہ رس نگاہ میں یہ ذوق و عرفان کی بربادی ہے،

دل از خوبان گرفتی خوب کردی ولیکن ذوق و عرفان را زیان کرد

اسی لئے وہ کسی طرح ذوقِ رندی سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور اپنے ناصحِ مشفق کو یہ جواب دیتے ہیں،

از ما بدار دست کہ رندی و عاشقی صد بار کردہ ایم و دگر می کنیم ما

اس جرأتِ رندانہ کی داد دینا آسان نہیں ہے، یہ ذوقِ سرمستی کا وہ جذبۂ محکم ہے، جس پر وعظ و پند کا کوئی سحر کارگر نہیں ہو سکتا، اور نہ ایک رندِ سرمست اربابِ عقل و ہوش کی تلخ نوائیوں کا اس سے زیادہ مختصر اور مسکت جواب دے سکتا ہے،

زہد و تقویٰ علامہ کے نزدیک کوئی بڑی چیز نہیں ہے، لیکن پھر بھی اُن کی نگاہوں میں اس کی جو وقعت ہے اس کا یہ حال ہے، فرماتے ہیں،

رہ و آئینِ تقویٰ نیز بد نیست اگر کارے نباشد می توان کرد

غور کرو کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا، کہ شاعر کے دل میں احساسِ رندانہ کی کتنی شدید جرأت موجود ہے،

اگرچہ رندی و مستی عقل و دانائی کی شان کے خلاف ہے، لیکن علامہ کو اس فرزانگی و دانائی کی قطعی حاجت نہیں،

گرچہ رندی و ہوس شیوۂ دانا نبود حاجتم نیست کہ فرزانہ و دانا باشم

اسی کے ساتھ ان کے ذوقِ سرمستی کا یہ بے باکانہ اعلان بھی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں،

چند در پردہ توان کرد سخن فاش بگو تو سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہان زدہ ام

ساغرے چند بہ یادِ رخِ رنگین خوردم قدحے چند در آغوشِ گلستان زدہ ام

جامۂ زہد چو بر قامتِ من راست نبود شیشۂ تقویٰ صد سالہ بہ سندان زدہ ام

تم کو معلوم ہے، کہ یہ جامۂ زہد علامہ کو گوارا کیوں نہیں ہے، اور وہ رندی و مستی کے کیوں اس قدر شیدا ہیں؟ اس کی وجہ خود انھوں نے ظاہر کر دی ہے فرماتے ہیں،

نرفتم بادا کہ با مستی و رندی خو کنم چون رہ و رسمِ ریا را مردِ میدان نیستم

اربابِ صومعہ کو یہ ادائے رندی کتنی ہی ناگوار ہو لیکن یہ کیا کم ہے، کہ انسان ریا سے جو سب سے بڑی معصیت ہے، محفوظ تو رہتا ہے اور اس کو ہاتفِ شیراز کا یہ طعنہ تو سننا نہیں پڑتا،

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

خواجہ حافظ نے ریاکار مدعیانِ زہد و تقویٰ کی کافی خبر لے لی تھی، اور اُن کے ہر اعمالِ حسنہ کی زہد پردہ دری کی ضرورت نہ تھی، لیکن پھر بھی رندی و مستی کے جوش میں ان بزرگوں کی شانِ تقدس کی حقیقت کے متعلق علامہ کے قلم سے جو کچھ بے ساختہ نکل گیا ہے، وہ لطف سے خالی نہیں ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

این نمی دانم کہ گبرم یا مسلمان نیستم این قدر دانم کہ زاہد آنچہ ہست آن نیستم

از ما بگیر درسِ فنونِ ریا کہ "ما" عمرے دراز زاہد و مستور بودہ ایم

ہر کسے چون شیخ میدانِ ریا را مرد نیست اندرین فن زحمتِ بسیاری بایست کرد

می خواہد اینکہ در رہِ رندی قدم نہد زاہد کہ ہم بہ شیوۂ تقویٰ تمام نیست

زاہد مگر ترا کار بہ لعلِ لبش افتاد زینگونہ حدیثِ تو دلآویز نبود است

خواہیم ترکِ شاہد و مے در برائے این از زاہدِ فسردہ دلے وام کردہ ایم

بادہ ہر چند تہ خرقہ توان نیز کشید   نرگسِ مست کے خلوت کہ رسوا باشم

لیکن جنابِ زاہد میں اتنی غیرت کہاں کہ اُن کو اپنے جبہ و دستار کی رسوائی کا خوف ہو، اُن کو خرقہ پائی تو اُن کے کارِ خلوت کا پردہ پوش ہے کہ دنیا کے سامنے اُن کے فریبِ تقدس کا راز طشت از بام نہ ہونے پائے،

ایک شعر اور ملاحظہ ہو،

من نیز ہمچو شیخ دم از زہد می زنم   اوّل مرا بہ بادۂ رے آزمون کنید

اندازِ بیان کی لطافت پر غور کرو، کیا کہنا تھا اور کس انداز سے کہا ہے؟ شاعر کے نزدیک زہد و تقویٰ دراصل تمام خواہشاتِ نفسانی پر قابو حاصل کر لینے کا نام ہے، اس لئے وہ اپنے ادعائے زہد کو آزمانا اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ آیا اس کے قلب و روح میں دنیاوی ترغیبات کو ٹھکرانے کی قابلیت پیدا ہوئی ہے، یا ابھی شیخ جی کی طرح وہ خود اپنے نفس کا تابع ہے کہ جہاں جامِ رنگین کا جلوہ نظر آیا، زہد و تقویٰ کی تمام مصنوعی ادائیں دفعتہً بھول گئیں، دیکھو شاعر نے کس لطیف پیرایہ میں شیخ جی کے ضعفِ ایمان و تقویٰ کی پردہ دری کی ہے، یعنی اپنے کو بھی شیخ جی کے ساتھ شامل کر لیا ہے، اور نتیجۂ آزمایش کو مخفی رکھا ہے، لیکن ذہن کو اس کی طرف منتقل ہونے میں دقت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وہ دراصل شیخ جی کے زہد کا امتحان ہے، ظاہر ہے کہ شیخ جی کہاں کامیاب ہو سکتے ہیں، بقول خواجہ حافظ کے اُن کے خرقۂ زہد و تقویٰ کی حقیقت تو یہ ہے،

خرقہ پوشی من از غایتِ دینداری نیست   پردہ بر سرِ صد عیب نہان می پوشم

مذکورہ بالا مثالوں سے اربابِ ذوق کو اگر سیری نہ ہوئی ہو، اور اُن کو علامہ کی کچھ اور تند و تیز رندانہ ادائیں دیکھنے کی تمنا ہو تو یہ چند اشعار اور حاضر ہیں،

توبہ از بادہ نہ کارِ منِ ناکس باشد   این قدر ہم اگرم عقل بود بس باشد

ہندوئے زلفش چو دامن ہمی چینید زمن   الله کہ ہم کافرم چندان مسلمان نیستم

دل ور دوائے طاعتِ حق حیلہ جو نبود   مغرور مینوم کہ بادہ بقدرِ وضو نماند

اسبابِ زہد میں سے صرف ایک تسبیح حضرت شبلی کے پاس رہ گئی تھی، اس کو بھی میخانے میں بھول آئے،

سبحۂ داشتم از جملۂ اسبابِ ورع   رفت از یادم و در خانۂ خمار بماند

شب تن وصال میں مستی و بیخودی کی بھی کچھ ادائیں ملاحظہ ہوں فرماتے ہیں،

آغوشِ شوق و دیدۂ گستاخ و دستِ شوخ   در وصل ہر چہ بود زمن خود بہ کار بود

دیدم و آئین ہم آغوشی نمیدانم کہ چیست   دستِ گستاخ انچہ فرمودست من آن کردہ ام

غور کرو اپنے کو کس لطیف انداز سے بری رکھا ہے، الزام تو اس وقت ہو سکتا تھا جب کوئی حرکت بالارادہ سرزد ہوتی، لیکن یہاں مستی و بیخودی کا یہ عالم ہے کہ جلوہ گاہِ محبوب میں قدم رکھتے ہی آغوشِ شوق، دیدۂ گستاخ، دستِ شوخ، سب خود بخود بے اختیارانہ سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں، ایسی حالت میں غریب عاشق کیونکر خطاوار قرار دیا جا سکتا ہے، وہ تو دستِ گستاخ کی فرمایشوں سے قطعاً مجبور تھا، یہ ایک نازک مرحلہ تھا، اس لئے شاعر نے بجائے تصریح کے صرف کنایہ سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے اندازِ بیان نہ صرف موثر بلکہ ابتذال سے محفوظ ہو گیا ہے،

سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا ہے، محبوب کو ٹھہرانا چاہتے ہیں، لیکن جو حیلہ ایجاد کیا گیا ہے، اس کی ندرت ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں،

من شبِ وصل باین حیلہ فریبش دادم   کین سحر نیست فروغ رخِ زیبائے تو ہست

کیا اس سے زیادہ لطیف اور موثر کوئی اور طریقۂ فریب تخیل میں آ سکتا ہے؟ عاشق کو بیجا خوشامد یا نیاز مندانہ التجائیں بھی نہیں کرنی پڑیں، محبوب بھی اپنے رخِ زیبا کی تعریف سے خوش ہو کر اصرار بیجا سے باز رہا، اور عاشق کا مقصد بھی حاصل ہو گیا، غور کرو اس اندازِ بیان کی بدولت یہ تمام مرحلے کس خوبی

سے طے ہوگئے!

بادۂ وصل کی چاشنی ایک نہایت لطیف چیز ہے، اس لئے علامہ کو یہ گوارا نہیں کہ کوئی بد مذاق اس کو منہ لگائے، کیونکہ اس سے اس کی لطافت برباد ہوجاتی ہے، اور وہ اس قابل نہیں رہ جاتی کہ کوئی خوش مذاق اس سے لذت اندوز ہوسکے،

گویا دشمن ہم از ذوقش نصیبہ بردہ است ‏ ‏ بادۂ وصلش چشیدم از مذاق افتادہ بود

لیکن ہر بادہ خوار کے کام و دہن کے لئے اس کا اندازہ آسان نہیں ہے، اس کی تمیز صرف بلند مذاق رندہی کرسکتے ہیں،

مذکورہ بالا مثالوں سے تم کو کافی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ علامہ کے مذاق رندی کی سرمستیوں کا کیا عالم ہے؛ لیکن ہمارے نزدیک جو چیز خاص طور پر قابلِ قدر اور علامہ کی صحیح المذاقی اور بلند نظری کی بہت بڑی دلیل ہے، وہ یہ کہ انتہائے سرور ومستی کی حالت میں بھی ان کی ادا میں ابتذال سے آلودہ ہونے نہیں پاتیں، حالانکہ رندی ومستی کے جذبات کو ابتذال کی آلائش سے پاک رکھنا نہایت دشوار ہے؛ اپنی اس بلندی مذاق کا راز علامہ نے خود ظاہر کردیا ہے،

شبلی خراب کردۂ چشم خراب اوست ‏ ‏ تو در گمان کہ مستی او از شراب بود

ظاہر ہے کہ جام شراب اور چشم مست کے ستم زدوں کی مستی میں زمین آسمان کا فرق ہے؛ علامہ کا جو ساقی ہے، اور اس نے اُن کے ساغر میں جو شراب ڈالی ہے، تم کو معلوم ہے کہ وہ کونسی شراب ہے؟ وہ وہ شراب نہیں ہے جو رگِ تاک سے کھینچ کر آتی ہے، بلکہ وہ آبِ طربناک ہے، جس کے لطیف اور نورانی قطرے خود ساقی کی مست وسرشار نگاہوں سے ٹپکتے ہیں،

ساقی آن مے بقدح ریخت کہ از نرگس خویش ‏ ‏ ہر نفس وام ہمی کرد بہ مینا می کرد

غور کرو ایسے جام لطیف کی مستی کبھی ابتذال وپستی کی طرف مائل ہوسکتی ہے؟ انداز بیان جس قدر

بلیغ اور دلکش ہے، اس کا اندازہ صاحب ذوق بآسانی کرسکتا ہے، کسی تشریح کی ضرورت نہیں، اور ایسے اشعار کا لطف در اصل ترجمہ میں قائم رہ سکتا ہے،

زہد ورندی دو متضاد چیزیں ہیں جن کا یکجا جمع ہونا بظاہر ممکن نہیں معلوم ہوتا، اس لئے اس موقع پر غالباً ناظرین کو حیرت ہوگی کہ سیرۃ النبوی اور الفاروق ایسی مقدس کتابوں کا مصنف ایک زہد سرمست کے لباس میں کیونکر نظر آسکتا ہے؟ اور یہ کیسے یقین ہوسکتا ہے کہ ذوق سرمستی کا یہ بے پناہ طوفان اسی کی جنبش قلم سے اٹھا ہے، جس نے ظہور قدسی کی جان فروز سطریں لکھ کر سعادت دارین حاصل کی ہے، اور اپنی اس روحانی پاکیزگی کا ثبوت دیا ہے، جو باوجود ولی نعمت نیم شبی اور اوراد سحری کے ہم موسم نشینوں کو نصیب نہیں ہوتی؛ لیکن در اصل حیرت کی کوئی وجہ نہیں، علامہ ایسے عالی ظرف اور صحیح الفطرت انسان بھی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں جن کے ایک ہاتھ میں جام شریعت، اور دوسرے ہاتھ میں سندان عشق ہوتا ہے، اور ایک دوسرے کی زد سے دونوں محفوظ رہتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ع

ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

زہد ورندی کا یکجا جمع ہونا بظاہر کو دشوار نظر آتا ہو، لیکن علامہ کی فطرت صالحہ اور ذوق سلیم کے نزدیک یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے،

زہد ورندی را بہم کردن چہ مشکل کار بود ‏ ‏ سعی بانگیختم کاین مشکل آسان کردہ ام

اس کوشش میں علامہ کے خامۂ حقیقت طراز نے جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کی بنا پر ان کا یہ دعویٰ بالکل بجا اور درست ہے،

زہد را من آشنائی دادہ ام باعاشقی ‏ ‏ ورنہ عمرے ہر دو را باہم نفاق افتادہ بود

اب ہم علامہ کے نغمۂ عشق ومحبت کو رخصت کرنا چاہتے ہیں کہ ابھی ہم کو ان کے دیگر اصناف سخن پر بھی تبصرہ کرنا ہے؛ لیکن اس موقع پر مناسب ہوگا اگر علامہ کے انداز بیان کی خصوصیات کا تذکرہ کر کے ہم اپنے قلم کی رفتار آگے بڑھا جائے

علاوہ شاعر ہونے کے علامہ بہت بڑے نقادِ سخن بھی تھے، اس لئے وہ بندش کی چستی، فقروں کے دروبست، الفاظ کی موزونی، ترکیبوں کی لطافت وغیرہ کا خاص لحاظ رکھتے تھے کہ بغیر ان چیزوں کے اندازِ بیان جو شاعری کا ایک ضروری اور اہم عنصر ہے، موثر اور دلکش نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ علامہ کا کلام معنوی اور لفظی اسقام سے بالکل پاک ہے، اور اس میں ایک خاص روانی و برجستگی پائی جاتی ہے، اور پڑھتے وقت سامع کو ایک خاص قدرت محسوس ہوتی ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف شیرین قدرتی چشمہ ہے، جس کی موجیں بلا کسی تکلف کے رقص کرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں، چونکہ علامہ کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اس لئے وہ لطیف ترکیبوں اور محاوروں کی آمیزش سے معمولی خیالات میں بھی ایک خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں، مذکورۂ بالا اشعار سے بھی ناظرین علامہ کے عام اندازِ بیان کی دلکشی کا کافی اندازہ کر سکتے ہیں، چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں،

شب بود و صد ہزار تماشائے دلفریب   صبح از کرانہ سر زد و بدرم کہ خواب بود

تا قدم رنجہ کنی بہر تماشائے چمن   ابر بہر تو سراپردہ بہ گلشن زدہ بود

چشمش بہ بوسہ ماند کہ ناتمام کرد   ساقی بہ جام ریخت مے نارسیدہ را

از بسکہ خوش نگاہ دو افتاد چشم او   کردیم فہم از دو سخن ناشنودہ را

صد بار در حریم چمن پیش روئے تو   گلچین بخاک ریخت گل ناز چیدہ را

نقشش بخیرہ پیش زما بودہ است و بس   گویا عزیز داشت دل نقد بودہ را

افسون طرازی نگہ نازدا بہ بین   چیزے بمن نگفت و مرا گفتگو نماند

در دور چشم بادہ گسار تو میفروش   خون میخورد کہ میکدہ را آبرو نماند

دیدہ و دل ہمہ دکان تماشا چیدند   کان تماشا کہ ز حسن و ادا می آید

فغان کہ آن ہمہ گنجینہ ہائے راز مرا   غمت ز سینہ برون داد و بزبان انداخت

ز فریب نرگس مست و کرشمۂ ساقی   مرا بہ پیروی شیوۂ فغان انداخت

شوخے کہ از غرور بخود ہم نمی رسد   عذرش بنہ اگر نتوانند بیار رسید

منکر خانقہ و صومعہ نتوان بودن   این قدر ہست کہ بت خانہ دلاویز تر است

ہم نے طوالت کے لحاظ سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے، ورنہ علامہ کے اندازِ بیان میں روانگی و برجستگی، اور شوخی و رعنائی کا یہی عالم عام طور پر نظر آتا ہے، ان اشعار کو دیکھو نفسِ خیال میں کوئی خاص جدت نہیں لیکن صرف طرزِ ادا نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے، جو محتاج بیان نہیں، جستہ و شگفتہ ترکیبوں کی لطافت بھی خاص لحاظ کے قابل ہے، اس قسم کی لطیف ترکیبوں سے کلام کا حسن دو بالا ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لئے ضرور ہے کہ شاعر علاوہ صحیح المذاق اور سخن سنج ہونے کے زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو، خوش قسمتی سے علامہ کی ذات ان تمام اوصاف کی جامع تھی، اس لئے اُن کے قلم سے ثقیل اور غیر فصیح اور نامانوس الفاظ کبھی نکل نہیں سکتے تھے، اور نہ پیرایۂ بیان کی بلندی و رعنائی میں کبھی کوئی فرق آ سکتا تھا، خیالات کے متعلق اہلِ فن کی جو رائے بھی ہو، لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک کامل الفن خاص ایرانی شاعر کا لب و لہجہ نہیں ہے، ہمارے نزدیک علامہ کی یہ شکایت

در سخن با خاکیانِ ہندی سنجی مرا   ہے چہ میدانی کہ این فن را چہ سامان کردہ ام

بالکل بجا اور حق بجانب تھی،

مسلمان سلاطین کی تصانیف

از

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

منبرِ علم اور اورنگِ حکومت کے دائرے الگ الگ ہین، ان کا اجتماع مشکل ہی سے ایک ذات مین ہوتا ہی لیکن یہ اسلام کی علم پروری کا فیض ہی کہ اس کے حلقہ بگوشون مین حکومت و سلطنت اور علم و فن کے اجتماع کی بہت سی مثالین ملتی ہین، اور بہتیرے مسلمان فرمانروا اقلیم علم کے بھی تاجدار تھے، جنھون نے سیاسی ہنگامہ آرائی کےساتھ اپنی کچھ علمی یادگارین بھی چھوڑی ہین، اس مضمون مین انہی کے مختصر حالات اور اُن کی علمی یادگارون کو پیش کرنا مقصود ہی،

مسلمانون کی اصلی علمی تاریخ عباسی عہد سے شروع ہوتی ہے، اس لئے سلاطین کی تصانیف بھی اسی زمانہ سے ملتی ہین، لیکن سلسلۂ بیان کے خیال سے خلفاے راشدین اور خلفاے بنی امیہ کے فضل و کمال اور اُن کی علم نوازی پر ایک نظر ڈال لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہی،

خلفاے راشدین اپنے علم و فضل کے اعتبار سے تمام صحابہ مین ممتاز حیثیت رکھتے تھے، گو موجودہ اصطلاح کے اعتبار سے انھون نے کوئی علمی یادگار نہین چھوڑی[1] لیکن وہ تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ جملہ دینی علوم کے حامل تھے، اور جب ان علوم کے اصول و فروع کی تدوین و تالیف شروع ہوئی تو انہی کے اقوال اور احکام موسّل راہ بلکہ بنیاد ثابت ہوئے،

[1] حضرت ابوبکر اور حضرت علی کی طرف بعض تحریری چیزین منسوب ہین، لیکن اُن کی حیثیت روایت سے زیادہ نہین ہی

وہ شعر و ادب کا بھی نہایت عمدہ مذاق رکھتے تھے، اسلام کے بعد گو شعر و شاعری کا جاہلی مذاق باقی نہین رہا تھا لیکن شعراے جاہلیت کے اشعار ان بزرگون کو کثرت سے یاد تھے، اور ہر شاعر کی خصوصیات اور اس کی شاعری پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے، حضرت عمر کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ جب کوئی فیصلہ کرتے تھے، اس کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی شعر ضرور پڑھتے تھے،[1]

خلفاے راشدین کبھی کبھی خود بھی طبع آزمائی کرتے تھے، اہلِ ادب خصوصاً ابن رشیق نے کتاب العمدہ مین ان کے بہت سے اشعار نقل کئے ہین، لیکن خلفاے اربعہ خصوصاً حضرت علی کی طرف جتنے اشعار منسوب کئے گئے ہین[2]، ان کا بڑا حصہ جعلی ہے،

خلفاے راشدین کے بعد اموی دور مین دوسری قومون کے اختلاط اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر مسلمانون مین تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہونا شروع ہوا، اور اموی خلفاء کی علم نوازی اور علمی سرپرستی نے اس ذوق کو اور زیادہ ترقی ہوئی،

اگرچہ اموی دور مین اسلامی علوم کی مختلف شاخین پیدا ہو چکی تھین، لیکن حکومت کی سرپرستی جس فن کو سب سے پہلے حاصل ہوئی، وہ فن تاریخ ہے، چنانچہ حضرت معاویہ[3] نے عبید بن شریہ سے تاریخ کی ایک کتاب "اخبار الماضین"[4] لکھوائی،

حضرت معاویہ کے بعد یزید اور اس کے لڑکے معاویہ کے زمانہ مین کوئی خاص علمی کام انجام نہین پایا، مگر یزید کے ایک دوسرے لڑکے خالد بن یزید نے خلافت سے مایوس[5] ہونے کے بعد البتہ اپنی ساری

[1] البیان والتبیین اور کتاب العمدہ وغیرہ مین ان واقعات کی تفصیل موجود ہے (ص ۵)، [2] حضرت علیؓ کے نام سے ایک مطبوعہ دیوان بازارون مین ملتا ہے، لیکن اہلِ نظر جانتے ہین کہ وہ زبان اور طرزِ ادا کے اعتبار سے کسی طرح اس نسبت کا مستحق نہین ہی [3] نواب عماد الملک مولوی سید حسن بلگرامی نے اس کتاب کے متعلق ایک تفصیلی مضمون لکھا ہی جو ان کے مجموعہ مضامین عماد مین موجود ہی [4] [5] معاویہ ثانی کے بعد یہ خلافت کا امیدوار تھا لیکن مروان نے اس کی جگہ لے لی

توجہ علم و فن کی جانب مبذول کر دی اور خصوصیت سے علم نجوم اور علم کیمیا میں دسترس بہم پہنچائی، اس نے اپنی سرپرستی میں فلاسفہ کی ایک جماعت قائم کی جس سے ہیئت و کیمیا کی بہت سی کتابیں عبرانی اور قبطی سے عربی میں ترجمہ کرائیں، کرہ کے ذریعہ علم ہیئت کے مسائل کو سمجھنے کی بنیاد بھی اسی نے ڈالی، ابن قفطی[1] نے لکھا ہے کہ قاہرہ کے کتب خانہ میں ایک کرہ ہے جس پر یہ عبارت درج ہے،

حملت هذه الكرة من الامير	یہ کرہ امیر خالد بن یزید کے یہاں سے
خالد بن يزيد بن معاويه (اخبار الحکما[2])	لایا گیا،

غرض اسلام میں دوسری زبان سے ترجمہ اور کرہ سازی کی ابتدا اسی کے علمی ذوق کی رہین منت ہے[3]، فلاسفہ میں خالد "حکیم آل مروان" کے لقب سے مشہور ہے،

اس کے بعد مروان اور پھر عبد الملک خلیفہ ہوئے، مروان کو علم و فن سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، تاہم ایک طبی کتاب[4] جس کا ترجمہ سریانی سے عربی میں ماسرجویہ یہودی نے کیا، اسی کے زمانہ کی یادگار ہے، (ابن ندیم)

عبد الملک البتہ علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتا تھا، فن حدیث اور شاعری پر خاص طور سے اس کی وسیع نظر تھی، عربی نثر بھی اچھی لکھتا تھا، جاحظ نے البیان والتبیین میں اس کی تحریر کا نمونہ نقل کیا ہے، مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر سے اس نے ایک تفسیر لکھوائی[5]، اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سرکاری دفاتر کی زبان جواب تک فارسی یا رومی تھی، اسے عربی کر دیا، جس سے عربی زبان کی بڑی ترقی اور اشاعت ہوئی[6]،

---

[1] قفطی نے ۶۴۶ھ میں وفات پائی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ساتوین صدی ہجری تک یہ کرہ موجود تھا۔ [2] جمال الدین قفطی نے لکھا ہو کہ قدیم زمانہ کے جس قدر قراباذین تھے، یہ کتاب ان سب سے عمدہ تھی (طبقات الاطبا ج ۱ ص ۱۱۶) [3] میزان الاعتدال ج ۲ ص ۰۹ [4] تاریخ الخلفاء،

عبد الملک کے بعد ولید اورنگ خلافت پر بیٹھا، وہ بہت کم پڑھا لکھا تھا، عربی تک غلط بولتا تھا، علم و فن سے اُسے کیا دلچسپی ہوتی، پھر بھی اس کے عہد میں حجاج بن یوسف کے ذریعہ ایک بڑا کام یہ انجام پایا، کہ قرآن جواب تک بے اعراب اور بے نقطے کے تھا، اس پر نقطے اور اعراب[1] لگائے گئے،

ولید کے بعد سلیمان نے خلافت پائی، سلیمان بڑا متدین اور صاحب علم و فضل تھا، اس کے زمانہ میں مذہبی رنگ بہت عام ہوا، مگر کوئی خاص علمی کام انجام نہیں پایا، سلیمان کے بعد خلافت کی باگ حضرت عمر بن عبد العزیز کے ہاتھ میں آئی، آپ نے جہاں اموی حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کی اصلاح و تجدید کی، وہاں بہت سے علمی کام بھی انجام دے،

آپ نے تعلیم دین کی طرف خاص توجہ کی، اور ہر فن کے اساتذہ کو اس فن کی تدریس کے لئے مقرر کیا[2]، مروان کے زمانہ کی مترجمہ قراباذین کا نسخہ شاہی کتب خانہ میں محفوظ تھا، اس کی بہت سی نقلیں کرا کے ممالک محروسہ میں بھیجیں[3]، ان کا سب سے بڑا علمی و مذہبی کارنامہ یہ ہے کہ حدیث نبوی کے جو ذخیرے متفرق محدثین کے پاس موجود تھے، بڑی احتیاط سے ان کا ایک مجموعہ تیار کرایا، اُس کی بہت سی نقلیں ملک کے تمام گوشوں میں بھیجیں[4]، اس طرح حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ ایک جگہ محفوظ ہو گیا،

عمر بن عبد العزیز کے بعد بنو اُمیہ کے جتنے خلفاء ہوئے، ان میں ہشام کے علاوہ کسی کو علم و فن سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور نہ انھون نے کوئی تعلیمی کام انجام دیا، ہشام البتہ خود صاحب علم[5] تھا اور اُسے علمی کامون سے دلچسپی تھی، اس نے امام زہری سے ۴۰۰ حدیثون کا ایک مجموعہ مرتب کرایا، ہشام کا ایک میر منشی جس کا نام سالم تھا، اس نے ارسطو کے رسالون کا جو سکندر کے نام تھے، عربی

---

[1] تاریخ الخلفاء [2] تہذیب التہذیب [3] طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۱۶ [4] جامع بیان العلم و فضلہ ص ۳۸ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۹،

مین ترجمہ کیا[۱] اس کے لڑکے جبلہ نے بہت سی فارسی کتابین عربی مین ترجمہ کین[۲]،

فارسی زبان مین غیر قومون کے علوم و فنون اور ان کے فرمانرواؤن کے حالات اور سیاسی واقعات پر مشتمل ایک کتاب تھی، ہشام نے اس کے ترجمہ کا حکم دیا، چنانچہ ۱۱۳ھ مین یہ ترجمہ مکمل ہوا، یہ کتاب مصور تھی، اور مسعودی کی نظر سے گذری تھی، تنبیہ الاشراف مین اُس نے اس کا مفصل حال لکھا ہے[۳]، ۱۲۵ھ مین ہشام نے وفات پائی، اور اس کی وفات کے ساتھ گویا بنو امیہ کی علمی اور سیاسی دونون حیثیتون کا خاتمہ ہوگیا،

۱۳۲ھ مین خلافت عباسیہ قائم ہوئی، عباسی عہد کو علمی اور تمدنی ترقیون کے اعتبار سے مورخین زرین دور (سنہرا دور) کہتے ہین یہ واقعہ ہے کہ اس دور مین علوم و فنون کی جو خدمت انجام پائی، دنیا کی تاریخ مین آپ اپنی مثال ہے، اسکا بڑا سبب یہ تھا کہ بیشتر عباسی خلفاء خود علم دوست اور علما نواز تھے، اور اُن کی علمی سرپرستی سے اس زمانہ مین ایک عام علمی مذاق پیدا ہوگیا تھا،

دولت عباسیہ کا پہلا خلیفہ سفاح تھا جس نے دو ڈھائی برس حکومت کی، اور وہ بھی تمامتر عباسی خلافت کے قیام و نظم مین گذرے اس کے بعد منصور مسند آرا ہوا، اسی سے خلافت عباسیہ کا اصلی دور سمجھنا چاہئے، منصور خود صاحب علم اور علم و فن کا بڑا قدردان اور سرپرست تھا، عباسی دور کی علمی تاریخ کا آغاز اسی سے ہوتا ہے، ابن صاعد نے طبقات الامم مین لکھا ہے کہ خلفاء عباسیہ مین منصور پہلا شخص ہے جس نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی اور انکو کافی ترقی دی، (ص ۵۰)

عبداللہ بن مقفع نے جو منصور کا کاتب تھا منطق و فلسفہ اور ادب کی بہت سی کتابین دوسری زبانون سے عربی مین ترجمہ کین[۴]، علم نجوم کی ایک مشہور کتاب السند ہند ہندوستان کے ایک عالم نے منصور کے سامنے پیش کی تھی، اس نے محمد بن ابراہیم الفزاری کو اس کے ترجمہ کا حکم دیا[۵]، اسی طرح اوس نے

لہ طبقات [illegible] ص [illegible] ٭ [illegible] طبقات الامم ص ۵۰ ٭ [illegible] ص ۴۰

طب کی بہت سی کتابین اپنے دربار کے مشہور طبیب بطریق جارج بن جبرئیل سے ترجمہ کرائین[۱]،

منصور کے بعد مہدی سریر آرائے خلافت ہوا، اس کے زمانہ مین ترجمہ و تصنیف کے اور کامون کے علاوہ ایک خاص کام یہ انجام پایا کہ اُس نے علماء کو حکم دیا کہ وہ ملحدون کے رد مین کتابین لکھین، اُن کے اعتراضات اور گمراہ کن خیالات کی تردید کرین[۲]، اس طرح اس کے عہد مین علم کلام کی بنیاد پڑی، مہدی کے بعد ہارون رشید اورنگ خلافت پر بیٹھا، یہ منصور سے بھی زیادہ علم دوست اور اہل علم کا قدردان تھا، اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بیت الحکمت کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا جس کے ذریعہ تالیف و ترجمہ کے بڑے بڑے کام انجام پائے، اور علوم و معارف کے گنجہائے گرانمایہ سے عربی زبان کا دامن مالا مال ہوا،

ہارون رشید کے بعد ابراہیم بن مہدی اور مامون کا زمانہ آتا ہے، جو ہمارا اصل موضوع ہے، لیکن اصل موضوع شروع ہونے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اسلام کے پورے دور مین حکومت کی سرپرستی کے علاوہ علماء کی انفرادی کوششون کے ذریعہ بھی نہایت اہم اور قیمتی علمی خدمات انجام پائے، مگر ان کا اصلی مقصد دین رہا، اس لئے اُن کی تالیفات و تصانیف بھی زیادہ تر دینی ہی علوم و فنون سے متعلق رہین، انکے مقابلہ مین حکومت یا خلفاء و سلاطین کی سرپرستی مین جو کام انجام پائے، ان کا تعلق زیادہ تر علوم دخیلہ، طب، نجوم، جغرافیہ، ریاضی یا تمدنی علوم موسیقی وغیرہ یا ادب و شاعری وغیرہ سے رہا، اس لئے "شاہان اسلام" کی علمی تاریخ مین یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ وہ اسلام کے مقابلہ مین غیر اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے زیادہ متاثر رہے، اس لئے اُن کی بیشتر تالیفات بھی انہی علوم سے متعلق ہین، گو ان مین استثنائی مثالین بھی ہین،

ابراہیم بن مہدی | عباسی خانوادہ مین ابراہیم بن مہدی پہلا شخص ہے، جو صاحب علم ہونے کے ساتھ

لہ طبقات الاطباء ج ۱ ص ۲۰۵ و ابن ندیم ص ۲۴۶ و ۱۷۷،

صاحب تصنیف بھی تھا،

ابراہیم خلیفہ مہدی عباسی کا لڑکا تھا، وہ سات ہی برس کا تھا کہ مہدی کا انتقال ہو گیا، اس لئے اس کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہین ہو سکا، لیکن اس کی مان شکلہ کی تربیت اور خود اس کی فطری صلاحیت کی وجہ سے اسے علم و فن سے تعلق پیدا ہو گیا،

خلفاء کی صحبت اور منادمت ابراہیم نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے چار خلفاء ہارون، امین، مامون اور معتصم کا زمانہ دیکھا، اور ان مین سے ہر ایک کی مجلس منادمت اور محفل شعر و ادب مین شریک ہوتا رہا، خصوصاً مامون کی کوئی مجلس مشکل ہی سے ابراہیم کی شرکت سے خالی ہوتی تھی،

امارت اور معزولی | مہدی کے بعد ہارون خلیفہ ہوا اُس نے ابراہیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہین کی، لیکن مامون جب خلیفہ ہوا، تو اُس نے ابراہیم کو بہت نوازا، اور دمشق کی امارت اس کے سپرد کی، دو برس تک وہ امارت کے فرائض انجام دیتا رہا، لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے معزول کر دیا،[1]

بغداد کی خلافت | مامون کو اہل بیت نبوی سے بڑی محبت تھی، چنانچہ اُس نے ۲۰۱ھ مین حضرت علی بن موسی رضا کو ولیعہد بنا کر تمام ممالک محروسہ مین اس کا اعلان کرا دیا، اور حکم دیدیا، کہ سیاہ عباسی رنگ کی وردیون کے بجائے سبز فاطمی رنگ کی وردیان اور لباس استعمال کئے جائین اور علی بن موسیٰ رضا کی عام بیعت کیجائے،

بغداد مین چونکہ بنی عباس کا اثر زیادہ تھا، اس نے اہل بغداد نے اس حکم کی خلاف ورزی کی، اور مامون کی بیعت فسخ کر کے ابراہیم کو خلیفہ منتخب کر لیا، اور مامون کے بجائے ابراہیم کا نام خطبہ مین پڑھا جانے لگا۔

مامون کو جب اس انقلاب کی اطلاع ہوئی تو اس نے خراسان سے بغداد کا قصد کیا مامون کی

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۶۰ تا ۲۷۰،

آمد کی اطلاع بغداد پہنچی تو پولیس اور فوج نے آہستہ آہستہ ابراہیم کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا، ابراہیم نے بہت کچھ ہاتھ پیر مارے، لیکن آخر کار اُسے تخت خلافت چھوڑنا پڑا، اور وہ بغداد سے باہر چلا گیا، اور کہین روپوش ہو گیا،[1]

چھ برس کے بعد مامون کے پاس معذرت نامہ لکھا، اور اپنی گذشتہ غلطیون کی معافی چاہی، مامون نے تھوڑی سی رد و قدح کے بعد اُسے معاف کر دیا، اور عفو و درگذر کے بعد اسے اپنا ندیم خاص بنا لیا،[2]

ابراہیم صورۃً بڑا بدہیئت اور بدوضع تھا، لیکن سیرۃً نہایت نرم خو، فیاض اور کشادہ دست تھا، اس کی فیاضی کے متعدد واقعات کتابون مین مذکور ہین،

علم ادب | ابراہیم شعر و ادب طب اور موسیقی مین اپنے پیشرو خلفاء سے ممتاز تھا، تمام اہل تذکرہ اس کے فضل و کمال پر ہم زبان ہین، ابن ندیم نے لکھا ہے،

اوّل نابغ نبغ من بنی العباس ثمّ من اولاد الخلفاء،	بنی عباس بھر خلفاء کی اولاد مین ابراہیم پہلا شخص ہے، جو علم و فن اور شعر و ادب مین غیر معمولی مہارت رکھتا تھا،
(فہرست ۱۶۴)	

خطیب بغدادی اور ابن خلکان نے لکھا ہے،

کان وافر الفضل غزیر الأدب .... ولم یر فی اولاد الخلفاء افصح منه لسانًا ولا احسن منه شعرًا،[3]	بڑا فاضل اور ادب مین وسیع النظر تھا، .... خلفاء کی اولاد مین اس سے اچھا شاعر اور اس سے زیادہ فصیح دیکھنے مین نہین آیا،

اغانی مین ہے،

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۶۹ [2] ایضاً [3] ابن خلکان،

کان رجلا عاقلاً فاضلاً فہیما — ابراہیم عاقل، فاضل، فہیم، ادیب، شاعر، اور

ادیبًا شاعرًا راویۃ الشعر — اہلِ عرب کے اشعار اور اُن کے تاریخی

وایام العرب خطیبًا فصیحًا (جلد ۹ ص۲۶) — واقعات کا راوی، خطیب اور فصیح شخص تھا،

اسحٰق موصلی کا قول ہے کہ عباس بن عبدالمطلب کی اولاد میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے

بعد ابراہیم جیسا فاضل آدمی پیدا نہیں ہوا، (اغانی)

شعر و شاعری ابراہیم کو شعر و شاعری کا خاص ذوق تھا، وہ خود شعر کہتا تھا، اور کثرت سے دوسرے شعراء کے اشعار اسے یاد تھے، اس کے جو چند مرثیے اور متفرق اشعار تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں ملتے ہیں، اُن سے اس کے ذوقِ شعری کا پورا اندازہ ہوتا ہے، سلاست، روانی اور جدتِ تشبیہات اس کے اشعار کی خاص خصوصیات ہیں،

عباسی دور میں شاعری نے حُسنِ معانی، تنوع مضامین اور جدتِ تشبیہ کے لحاظ سے بڑی ترقی کی، لیکن ان محاسن کے ساتھ ایک عیب یہ پیدا ہوگیا کہ اموی دور کی طرح الفاظ کی بندش، جملوں کی چستی اور خالص ٹکسالی زبان باقی نہیں رہی، چنانچہ اس دور کے خالص عربی نژاد شعراء کے علاوہ مشکل سے کسی شاعر کا کلام اس عیب سے پاک ہوگا،

ابراہیم گو خالص عربی نژاد نہیں تھا، اس کی ماں عجمی تھی، لیکن اس کے کلام کا جو نمونہ ہمارے سامنے ہے، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری دورِ عباسیہ کے محاسن شعری کی حامل، اور اس دور کے معائب سے بڑی حد تک محفوظ ہے، غالبًا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت خالص عربی ماحول یعنی طائف میں ہوئی تھی،

اس کے مراثی اور غزل کے چند اشعار نمونۃً نقل کئے جاتے ہیں،

ابراہیم کے دو لڑکے تھے، اور دونوں کا انتقال اس کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا، اس کے

ایک لڑکے کا نام احمد تھا، اس سے اس کو بڑا تعلق خاطر تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے بڑے پر درد اور دلسوز مرثیے کہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

نائی اخر الایام عنك حبیب — فللعین سح دائم وغروب

زندگی کے آخری ایام میں تم سے حبیب دور ہوگیا، اب زندگی بھر رونا اور آنسو بہانا ہے،

دعته نوی لا یرتجی اوبۃ لہا — فقلبك مسلوب وانت کئیب

اس کو جدائی نے بلا لیا ہے، اب اس کے لوٹنے کی امید نہیں ہے، اے ابراہیم تمہارا قلب لٹ چکا اور تمہارے حصہ میں اب غم ہی غم ہے،

یئوب الی اوطانہ کل غائب — واحمد فی الغیاب لیس یئوب

ہر جانے والا اپنے وطن میں واپس آتا ہے لیکن احمد ان جانے والوں میں ہے جو واپس نہیں لوٹیگا،

یہ مرثیہ بہت لمبا ہے، طوالت کے خیال سے ہم صرف چند اشعار اور نقل کرتے ہیں جن میں کوئی تشبیہ یا تمثیل موجود ہے،

تولی وبقی بیننا طیب ذکرہ — کما فی ضیاء الشمس حین تغیب

وہ چلا گیا لیکن اپنی یاد ہمارے درمیان چھوڑ گیا ہے، جس طرح آفتاب کے غروب ہونے کے بعد بھی شفق باقی رہتی ہے، جو اس کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے،

یسیرًا من الایام لم یرو ناظری — بہا منہ حتی اعلقتہ شعوب

تھوڑے دن بھی میری آنکھیں اس کی دید سے آسودہ نہیں ہونے پائی تھیں کہ وہ لقمۂ اجل ہوگیا،

کظل سحاب لم یقم غیر ساعۃ — الی ان اطاحتہ فطاح جنوب

وہ بادل کے سایہ کی مانند ابھی تھوڑی دیر بھی باقی نہیں رہا تھا کہ اسکو دکھنی ہوا اڑا لے گئی

والشمس لما من غمام تحجبت　　　مساء وقد ولت وآن غروب

بادل کے آفتاب کے مانند تھا، کہ شام تک تو وہ بادل مین چھپا رہا جون ہی بادل چھٹا تو غروب ہوگیا، یعنی جب وہ جوان ہوا تو موت آگئی،

احمد ہی کے ایک دوسرے مرثیے کے چند اشعار یہ ہین :-

عصتك عين ودموعها شتن　　　فليس يغشى جفونها الوسن

اے ابراہیم! آنکھین تمھارے قابو مین نہین رہین کہ اُن سے آنسو برابر جاری ہے، اور اُن کے لئے نیند بالکل حرام ہوگئی ہے، ذرا جھپکی بھی نہین آتی،

لما ثوی احمد الضریح وکان　　　الزاد منه الحنوط والکفن

جب احمد کو قبر مین لٹا یا گیا تو اس کا زاد سفر صرف خوشبو اور کفن تھا،

والموت یغشی بیاض سنته　　　کالشمس یغشی ضیاءها الدجن

موت نے اس کی پیشانی کی رونق اس طرح چھپالی جس طرح سورج کی روشنی کو رات کی تاریکی

غزل کے چند اشعار

باغزالا لی الیه　　　شافع من مقلتیه

اے غزالِ رعنا تیری　　　آنکھین خود میری سفارش کررہی ہین

بابی وجهك ما　　　اکثر حسادی علیه

مین تیرے چہرے پر قربان ہون　　　جس پر بہت سے حسد کرنے والے ہین

بابی من انا ما　　　سور بلا اسر لدیه

مین اس کے قربان جس کا مین بغیر قید و بند کے اسیر ہون

والذی یقتلنی　　　ظالما ولا یعدی علیه

اس کے قربان جو ظلم سے مجھے قتل کرتا ہے، لیکن اس پر کوئی ظلم نہین کیا جاسکتا،

نثر ابراہیم کی نثر کے جو نمونے موجود ہین، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ نظم کی طرح نثر پر بھی اسے پوری قدرت تھی، اور وہ مسجع مقفٰی عبارت اور نامانوس الفاظ کے استعمال سے جو اس زمانہ کا عام طرز تھا، پرہیز کرتا تھا، اور اپنے کاتبون کو بھی اس سے منع کرتا تھا، ایک کاتب کو لکھتا ہے،

ایاک التتبع لوحشی الکلام طمعا　　　حصول بلاغت کی خواہش مین نامانوس
فی نیل البلاغة فان ذلك العی　　　الفاظ کے استعمال سے بچو، یہ تحریر کی
الاکبر وعلیك بما سهل من　　　خوبی نہین، بلکہ عجز اور عدم قدرت کا ثبوت
الکلام مع التحفظ من الفاظ　　　ہے، سوقیانہ الفاظ سے بچتے رہو جہان تک
السفل　　　ہوسکے آسان اور عام فہم الفاظ کا
(ابن عساکر ج ۲ ص ۲۰۵)　　　استعمال کرے،

موسیقی عباسی عہد مین دوسرے تمدنی فنون کی طرح فنِ موسیقی کو بھی بڑا عروج ہوا خصوصا عباسی خلفاء کی قدردانی اور زرپاشی نے اس کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا، جس کے ثبوت و تفصیل کے لئے اغانی کی اکیس جلدین آج بھی موجود ہین،

ابراہیم بھی اسی ماحول مین پلا تھا، اس لئے اس نے بھی اس فن مین بڑی مہارت بہم پہنچائی، مہارتِ فن کے ساتھ خوش گلوئی کی دولت بھی اسکو ملی تھی، اسلئے وہ دربار کے خاص مغنیون مین داخل کرلیا گیا، لیکن اس کے اصلی جوہر مامون اور معتصم کے زمانہ مین پوری طرح نمایان ہوئی، صاحبِ اغانی نے اس کے حسنِ آواز اور مہارتِ فن کا تذکرہ بہت تفصیل سے کیا ہے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ گانے اور راگ مین پرانے قواعد اور اصولون کی پابندی نہین کرتا تھا، بلکہ خود نئے نئے راگ اور طرز پیدا کرتا تھا، جب اہلِ فن نے اس پر اعتراض کیا، تو اس نے جواب دیا کہ مین نے اس فن کو

پیشہ نہین بنایا ہے، بلکہ اپنے نشاطِ طبع اور تکمیلِ ذوق کے لئے اختیار کیا ہے،[1]

ابراہیم کی اسی جدت طرازی نے مغنیون کے دو گروہ کر دیئے تھے، کچھ قدیم طرز اور اصول سے ذرا بھی ہٹنا نہین چاہتے تھے، اور ابراہیم کی اس جدت طرازی کو بُرا سمجھتے تھے، اور کچھ ابراہیم کی جدت کے حامی اور اس کو پسند کرتے تھے،[2]

ابراہیم کی ایک بہن علیہ تھی، اسے بھی فنِ موسیقی مین بڑا کمال حاصل تھا، اہلِ تذکرہ نے اس کی مہارتِ فن کا تذکرہ بھی ابراہیم کے ساتھ ساتھ کیا ہے، وہ شاعرہ بھی تھی، ابن ندیم نے لکھا ہے کہ مین نے اس کے اشعار کا ایک مختصر مجموعہ دیکھا ہے،[3]

طب ابراہیم کو فنِ طب مین بھی درک تھا، ہارون و مامون کے دربار کے اکثر اطبا اس کے ہم جلیس تھے، خصوصاً مشہور عیسائی طبیب جبرئیل بن بختیشوع کے ساتھ اس کا بہت زیادہ ربط و ضبط تھا، وہ اکثر طب اور اطبا کے متعلق جبرئیل سے سوالات کیا کرتا تھا، ایک مرتبہ اُسنے وجع الکبد[4] کے مرض کے متعلق دریافت کیا، جبرئیل نے اس کی پوری تفصیل بتائی، ابراہیم بہت متعجب ہوا، پھر جبرئیل نے اس مرض کے متعلق اسکو مزید باتین بتائین[5]

اپنے زمانہ خلافت مین ابراہیم ایک مرتبہ بخار مین مبتلا ہوا، جب اچھا ہو گیا، تو ایک روز کشلہ[6] پکوایا، جبرئیل بھی دستر خوان پر موجود تھا، اُس نے ابراہیم کو اس کے کھانے سے منع کیا، ابراہیم نے سبب پوچھا، اُسنے کہا کہ خلیفہ کو اگر ایک روز بھی بخار آجائے تو مین ایک سال تک اسکو کشلہ کھانے کی اجازت نہین دیسکتا، ابراہیم نے اس کو پھر پوچھا کہ تم کس کشلہ کو روکتے ہو جو دودھ سے بنا ہو یا سادہ، اُسنے کہا کہ ایک سال کی قید تو اس کشلہ کے متعلق ہے جو بغیر دودھ کی آمیزش کے بنا ہو، اور جو دودھ کے ساتھ بنا ہو اسکے لئے تین سال کی قید ہے،[7]

---

[1] اغانی ج ۵ ص ۱۰۰ [2] ایضاً [3] ابن ندیم ص ۲۳ [4] اس مرض مین آدمی سینے کے بل جھک جاتا ہے اور سال چھ مہینہ تک اپنی جگہ سے ہل نہین سکتا [5] عیون الانبیاء ج ۱ ص ۱۳۱ [6] یہ ایک کھانا ہے جو باقی دودھ یا گھی اور چیزین آمیز کر کے پکایا جاتا ہے [7] عیون الانباء،

ابراہیم کا ایک غلام یوسف تھا جس کی سند سے ابراہیم کی بہت سی روایتین طبقات الاطبا مین مذکور ہین، صفحہ ۱۱۵ سے ص ۱۳۲ تک اس کی تفصیل جا بجا مل سکتی ہے، یوسف کا ذکر قفطی نے اخبار الحکماء (الف) مین بھی کیا ہے (ص ۱۹۵)

ابراہیم کو یوسف سے غایت تعلق کی بنا پر لوگ اس کو ابن ابراہیم یعنی ابراہیم کا بیٹا کہتے تھے،

ابراہیم کو کھانے کھلانے کا بھی بڑا ذوق تھا، اور اس مین وہ بڑے اسراف سے کام لیتا تھا، دمشق کی امارت کے زمانہ مین ہارون ایک بار اس کا مہمان ہوا، تو اس نے سو مچھلیون کی صرف زبانین پکوائین، ہارون رشید کو یہ اسراف بہت ناپسند ہوا، اور اسنے دستر خوان سے اس کھانے کو اٹھوا دیا،[1]

تصانیف ابراہیم کو جن فنون سے دلچسپی تھی، اس نے ان سب مین کوئی نہ کوئی تحریری یادگار ضرور چھوڑی تھی، ابن ندیم اور ابن خلکان نے اس کی حسب ذیل کتابون کا ذکر کیا ہے،

(۱) کتاب ادب ابراہیم (۲) کتاب الطبخ، یہ کتاب کھانے کے اقسام اور اس کے پکانے کے طریقون پر ہے، اگر یہ کتاب دستیاب ہو جاتی تو اس وقت کی معاشرت کے بہت سے گوشون پر اس سے روشنی پڑتی (۳) کتاب الطب (۴) کتاب الغناء (۵) عربی دیوان۔

ان مین سے کسی کتاب کے موجود ہونے کا علم نہین ہے، اس کے دیوان کے متعلق البتہ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ تک سو اوراق کا ایک مجموعہ موجود تھا، اور اس کی نظر سے گذرا تھا، ابن ندیم نے اوراق کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر ورق مین دو صفحے، اور ہر صفحہ مین بیس سطرین تھین، اس کے معنی یہ ہوئے کہ چوتھی صدی ہجری تک اسکے چار ہزار اشعار موجود تھے،[2]

---

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۰۷، [2] ابن ندیم ص ۱۶۸، ۲۲۳،

بابُ المُراسَلةِ والمُناظَرة

گھگھڑون کی تاریخ

از

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی

جناب مکرم، اسلم صاحب بگڑالہ جہلم کا مکتوب گرامی ملا، مضمون سے آگاہ ہوا،[1] مین جناب موصوف کا شکرگذار ہون کہ انھون نے ایک خاص مسئلہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع عنایت فرمایا، میری کتاب "تذکرۂ گوہر نامہ" پر تنقید کرنا چاہتے ہین، تو خوشی سے تحریر فرما سکتے ہین، یہ تو ایک علمی بحث ہے صاحب البیت ادری بما فیھا، وہ خود اس قوم اور خاندان کے ہین، اس لئے ان کی واقفیت یقیناً مجھ سے زیادہ ہوگی، اُن کی توضیح سے مین بھی فائدہ اٹھاؤن گا،

اب رہا اصل مسئلہ یعنی "گھگڑون نے محمود غزنوی پر حملہ کیا"، تو چونکہ اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہین تھی، اس لئے مین نے اس پر کوئی ریسرچ نہین کیا، کیونکہ یہ کوئی عجیب بات نہین تھی، محمود غزنوی کی فوج مین ہندو فوج بھی ہوتی تھی، اور وہ غزنوی فوج کے ساتھ مل کر ہندو راجاؤن پر حملہ آور ہوتی تھی،

---

[1] مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی نے گھگڑون کی تاریخ گھگڑ نامہ پر معارف مین ایک مضمون لکھا تھا، اس مین فرشتہ کے حوالہ سے تحریر کیا تھا کہ محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملہ کے زمانہ مین گھگڑون نے پنجاب کے راجہ انند پال

اسی طرح ملتانی مسلمان غزنوی فوج پر ہندوؤن کے ساتھ حملہ آور ہوئے، خود مسلمان مسلمانون پر حملہ آور ہوتے رہے، شہاب الدین غوری نے غزنہ کے سلطان سے لاہور لیا، اور اس کو قید کرکے لے گئے، پس گھگھڑ اس وقت مسلمان ہو چکے ہون یا ہندو ہی ہون اگر انھون نے راجہ پنجاب کے ساتھ ملکر اپنے وطن کی طرف سے مدافعت کی، تو یہ کونسی عجیب بات ہے، یہ نہ تو قابلِ شرم ہے، اور نہ قابلِ الزام، آخر انھی گھگڑون نے شیرشاہ سوری اور ابراہیم سے کس قدر جنگ کی، اب رہی یہ بات کہ خود فرشتہ نے یہ واقعہ صحیح لکھا ہے یا نہین، تو افسوس ہے کہ فرشتہ نے اس بیان مین اپنے کسی ماخذ کا حوالہ نہین دیا، جناب مکرمی اسلم صاحب نے جن جن کتابون کا حوالہ دیا ہے، مین نے اُن کا مطالعہ کیا، تاریخ طبقات ناصری نے محمود غزنوی کا بہت مختصر سا حال لکھا ہے، زیادہ اس کے اوصاف بیان کئے ہین، اس لئے یہ واقعہ اس مین نہین ہے،

طبقاتِ اکبری جلد اول کلکتہ مین ۳۹۹ھ کی جنگ کا حال ہی نہین لکھا ہے، اور تاریخ بدایونی جلد اول کلکتہ بھی اس بیان سے خالی ہے، تاریخ کامل لابن اثیر مین ۳۹۹ھ کے تحت محمود کا کوئی ذکر نہین کیا ہے، یہی حال ابن خلکان کا ہے، بیہقی مین اس کو تلاش کرنا فضول ہے، کیونکہ اس کی تاریخ مسعود بن محمود غزنوی سے شروع ہوتی ہے،

عتبی نے تاریخ یمینی مین نہ صرف اس واقعہ کو بلکہ ۳۹۹ھ کا کوئی واقعہ ہی نہین لکھا ہے، تاریخ الفی نایاب ہے، ابھی تک میری نظر سے نہین گذری، اس کا ایک نسخہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری کی فہرست مین ملتا ہے، مین نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے، لیکن تاریخ الفی، بدایونی، طبقاتِ اکبری

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۲) کی حمایت مین جنگ کی جس مین کئی ہزار مسلمان قتل ہوئے، اسلم خان صاحب نے جن کا خیال ہے کہ گھگڑ قوم خود محمود کے ساتھ ہندوستان آئی تھی، اس بیان پر اعتراض کیا تھا، اس مراسلہ مین انھون نے اس کا جواب دیا ہے، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، معارف ماہ جولائی و اگست ۱۹۴۲ء،

سب تقریباً ایک ہی زمانہ کی ہیں، یقین ہے کہ اس میں بھی یہ واقعہ نہ ہوگا، مآثر رحیمی وخلاصۃ التواریخ میں بھی تفصیل نہیں ہے،

میرے اس بیان سے معلوم ہوگیا کہ واقعی فرشتہ اپنے بیان میں منفرد ہے، اور تاوقتیکہ اسکی تائید کسی دوسری تاریخ سے نہ ہو یقینی نہیں کہہ سکتے، فرشتہ کے تین نسخے میرے پاس موجود ہیں، حیدرآباد کے نسخہ میں "کھکر" لکھا ہے، دوسرا نول کشور کا ہے جس میں "کہکر" تحریر ہے، اور تیسرا ۱۸۳۲ء کا ہے جو بمبئی میں ایک انگریز کپتان …… کی زیر نگرانی طبع ہوا ہے، اس میں بھی "کہکر" ہے، پس ممکن ہے، یہ لفظ کھوکھر کا مفرس ہو،

میرے دوست جناب اسلم خان صاحب نے ایک فقرہ لکھا ہے، کہ

"اصولی لحاظ سے بھی محمود کے چھ سو برس کے بعد کے مورخ کی روایت کی کوئی حقیقت نہیں ہے"،

"اگر اس قسم کے اصول صحیح تسلیم کرلئے جائیں، تو "تاریخ طبری، کامل، ابن خلدون، طبقات ناصری، تاریخ الفی، بدایونی، آئین اکبری، ان میں سے کوئی معتبر نہ رہے گی، اس لئے یہ اصول صحیح نہیں کہ مدت کے بعد جو تاریخ لکھی جائے، اس کی روایت صحیح نہ سمجھی جائے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا ماخذ کیا ہے، اور وہ صحیح مستند، قریب العہد یا شاہد عینی ہے یا نہیں، اور پھر اس کے معاصر یا قریب العہد مورخ اس کے مؤید ہیں یا نہیں،

میرے مکرم دوست نے یہ بھی لکھا ہے کہ گکھڑ محمود کی معیت میں وارد ہند ہوئے، لیکن کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرا کہ قوم محمود کے ساتھ ہندوستان آئی، سوائے آئین اکبری کی ایک شاذ روایت کے جس کی کسی تاریخ سے تائید نہیں ہوتی، اور بقول آپ کے چھ سو برس بعد کے مورخ کی روایت کس طرح صحیح تسلیم کی جائے،

میری کتاب "گوہر نامہ" مکمل ہوچکی ہے، تقریباً اٹھارہ بیس کتابوں سے حاشیہ میں اصل کتاب کی تائید یا تردید کی ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ التمش اور بلبن کے عہد تک گکھڑ قوم میں ہندو مذہب رکھنے والے لوگ موجود تھے، جن میں سے ایک کا نام "گل چند" تھا، بدایونی میں بھی اس کے حوالے ملتے ہیں،

یہ کتاب اس وقت بھوپال میں ایک کاتب کو صاف کرنے کے لئے دیدی ہے انشاءاللہ جلد طبع ہوجائے گی،

ادبیات

لذتِ غم

از

جناب شفیق صدیقی جونپوری

جھرمٹ شادابیِ گل کی فراوانی بھی دیکھ
پھر چمن سے دورِ نکہت کی پریشانی بھی دیکھ

اے گرفتارِ فریبِ رنگ و بو ہشیار باش
اپنے پھولون کا مآل چاک دامانی بھی دیکھ

چاندنی مین بحر کی لہرون کی تابانی بھی دیکھ
تو انھین موجون مین پھر کشتی کو طوفانی بھی دیکھ

کشتی و ساحل کی سیر مین جشن محفل تا کجا
آ مرے غم کا تماشا میری ویرانی بھی دیکھ

لوگ کہتے ہین مسرت ہی شبابِ زندگی
مین سمجھتا ہون مسرت کو حجابِ زندگی

زندگی کے واسطے درکار ہے سوز و گداز
تلخیٔ غم ہی سے ہے کیفِ شرابِ زندگی

زندگی محدود کر دون کیون خوشی کے واسطے
غم مین بھی ہوتی ہے لذت آدمی کے واسطے

جس کے احساسِ الم سے چاک تھا دامانِ صبر
آج روتا ہون اسی آشفتگی کے واسطے

وہ دعاؤن پر دعائین اشکِ حسرت صبح تک
وہ نیازِ بندگی نازِ مشیت صبح تک

چاند کی کرنون سے باتین وہ ستارون سے خطاب
اور بالین پر چراغِ شامِ غربت صبح تک

لاکھ راتین تجھ پہ صدقے اے پریشانی کی رات
کیا ہوئی یارب مری آشفتہ سامانی کی رات

قطرہ ہائے اشک سے دامن پہ تارون کا سمان
اے وہ میری بہارِ سوزِ پنہانی کی رات

ہر نفس مین زندگی صبرِ دلِ ایوب کی
دل کے داغون مین سپیدی دیدۂ یعقوب کی

کس قدر تھی کیف آگین ظلمتِ شامِ الم
اک سیاہی تھی غلافِ کعبۂ محبوب کی

اب وہ تسکین آفرین باتین وہ غمخواری کہان
وہ مناجاتین کہان راتون کی بیداری کہان

ہو گیا خاموش کوئی ہو گئے افسانے ختم
شمع کے آنسو کہان شبنم کی خونباری کہان

اب چراغِ کشتۂ محفل کا عالم دیکھئے
دھوم سے ہوتا ہے پروانون مین ماتم دیکھئے

اب نہ گرمی ہے نہ خنکی درہم و برہم ہے بزم
بجھ گیا ہے دل تو شعلہ ہے نہ شبنم دیکھئے

شب کی محفل لٹ گئی سورج اگر آیا تو کیا
خونِ انجم ہو چکا نورِ سحر آیا تو کیا

بند کین بیمار نے آنکھین، ہوئی بالین اداس
اب زمانہ نعش پر باچشمِ تر آیا تو کیا

تو نہین گھر مین تو فکرِ ساز و ساماں کیا کرون
کوئی مقصد بھی تو ہو جینے کا ارماں کیا کرون

دل بھی صابر ہے زبان پر شکر کے کلمات بھی
میرے مالک مین علاجِ چشمِ گریاں کیا کرون

غزل

از جناب ڈاکٹر محمد عزیز ایم اے پی ایچ ڈی علیگ

رخِ رنگین یار دیکھ لیا
اک گلِ نو بہار دیکھ لیا

صحبتین صبح و شام کی نہ رہین
یہ بھی لیل و نہار دیکھ لیا

اب تو دے رخصتِ فغان کہ بہت
ضبط و صبر و قرار دیکھ لیا

وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی
بات کا اعتبار دیکھ لیا

ہو برا بے قراری دل کا
تجھکو بھی اشکبار دیکھ لیا

شکوہ بیجا نہ کر کہ اب تو عزیز
یار کو شرمسار دیکھ لیا

مطبوعات جدیدہ

ریاض الانشاء، مرتبہ ومصححہ پروفیسر شیخ چاند بن حسین بی لٹ آکسن، تقطیع بڑی، ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحے، کاغذ اعلیٰ، ٹائپ بہتر، قیمت بارہ روپے، پتہ:۔ مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن،

دکن کے بہمنی سلاطین کا نامور وزیر محمود گاوان الملقب بہ خواجہ جہان گیلانی المقتول ۸۸۶ھ دوسرے اوصاف وکمالات کے ساتھ بڑا فاضل اور فارسی زبان کا بے مثل ادیب وانشا پرداز تھا، اُس نے مختلف اسلامی ملکون کی سیاحت کی، اور وہان کے علماء اور اصحاب کمال سے استفادہ کیا تھا، اور اسلامی دنیا کے بہت سے علما ومشائخ سے اس کے تعلقات تھے، حافظ سخاوی نے جو اس کے معاصر تھے، الضوء اللامع مین اس کے حالات لکھے ہین، (کتاب مذکور ج ۱۰ ص ۱۴۴) خواجہ نے سلاطین بہمنی کی جانب سے سلاطین وامراء اور ذاتی حیثیت سے اپنے اعزہ، احباب، علماء ومشائخ اور امراء وعمائد کو جو خطوط لکھے، ان مین سے بہت سے خطوط کی نقلین محفوظ رہ گئین جن کا مجموعہ ریاض الانشاء کے نام سے موسوم ہے، اس مین ۱۴۸ خطوط ہین جو فارسی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہین، اور بقول مرتب ان مین کاتب کے ذہن مرصع کار نے قرآن وحدیث، الٰہیات وفلسفہ نجوم وریاضیات، شعر وسخن، معانی وبیان، جغرافیہ وتاریخ، حیوانات وطبعیات، مناظر قدرت اور واقعات زندگی کے جواہر پارون کو ایک دلکش انداز مین ترتیب دیا ہے، ان خصوصیات کے علاوہ ان مین بہمنی سلاطین کی جانب سے سلاطین روم وعراق، اور گجرات، مالوہ اور جونپور کے

مسلمان بادشاہون کے نام خطوط اور دکن کی سیاسی تاریخ کے متعلق بہت سے ایسے معلومات ہین، جو دوسری تاریخون مین نہین مل سکتے، اس لئے ان کی علمی وادبی حیثیت سے قطع نظر تاریخی حیثیت سے بھی اُن کی بڑی قدر وقیمت ہے، اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانون مین پائے جاتے ہین، مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد نے پروفیسر شیخ چاند بن حسین سابق مشیر وزارت تعلیم ہندوستان کی تصحیح وتحشیہ کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے، فاضل مرتب نے بڑی محنت وقابلیت سے چھ قلمی نسخون کی مدد سے مقابلہ وتصحیح کرکے یہ نسخہ مرتب اور حاشیہ مین اختلاف نسخ کو واضح کیا ہے، اس سے بھی زیادہ مفید کام انھون نے یہ انجام دیا، ہے کہ ان خطوط کی عبارت بڑی ادیبانہ اور انشاپردازانہ ہے، جس کا سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان نہین ہے اس لئے لائق مرتب نے کتاب کے شروع مین ترتیب وار ہر خط کا اردو مین خلاصہ دے دیا ہے، اور ان مین جو نام آئے ہین یا جن واقعات کا اجمالی ذکر ہے، اُن کے حالات کی تفصیل کے لئے دوسری تاریخون اور تذکرون کے حوالہ دیدیئے ہین، جن سے ان خطوط کی افادی حیثیت بڑھ گئی ہے، اور اُن سے استفادہ بھی آسان ہو گیا ہے، کتاب کے شروع مین ڈاکٹر غلام یزدانی کے قلم سے کاتب ومکتوبات کی خصوصیات کا مختصر تذکرہ، اور مرتب کے قلم سے اُن کی ترتیب کے متعلق ضروری معلومات تحریر ہین، کتاب کے آخر مین اسماء واعلام کا انڈکس ہے گو ان مکاتیب کی علمی وادبی حیثیت کے قدردان اب بہت کم ہین، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی اشاعت ایک مفید تاریخی خدمت ہے، لائق مرتب نے ان کی ترتیب وتصحیح مین جو محنت کی ہے، اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، البتہ بعض مقامات پر خفیف سا تسامح ہو گیا ہے، مثلاً مرتب نے تمہید مین الضوء اللامع کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ محمود گاوان نے قاہرہ مین شیخ بخاری (محمد بن محمد بن محمود الشمس الحنفی) کے علم وفضل سے استفادہ کیا تھا (ص ۷)، یہان الضوء اللامع کی عبارت سمجھنے مین تسامح ہو گیا ہے، اصل عبارت یہ ہے، ولقی شیخنا

بالقاہرۃ فی ثلاث واربعین (وثمانمائۃ) فاخذ منہ مجالس من البخاری وتناولہ منہ الضوء اللامع جلد ۱۰ (ص ۱۴۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ محمود گاوان ہمارے شیخ کے درس صحیح بخاری مین شریک ہوا، بخاری شمس نخفی کی وطنی نسبت نہین ہے، بلکہ اس سے مراد صحیح بخاری ہے،

صدپارۂ دل، از جناب خواجہ دل محمد صاحب ایم اے سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد سے، پتہ خواجہ بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور،

مصنف کہنہ مشق شاعر ہین، صدپارۂ دل اُن کی رباعیون کا مجموعہ ہے، جو موضوع کے اعتبار سے پانچ حصون مین تقسیم ہے، میخانۂ عرفان، طلسم شہود، اسرار و حقائق، اعمال و اخلاق، نیرنگِ جذبات، ان تمام موضوعون پر حکیمانہ رباعیان ہین، اور پورا مجموعہ خیالات کی گہرائی و پختگی زبان و بیان کی صحت و صفائی اور دوسرے محاسن شاعری کے اعتبار سے مصنف کی کہنہ مشقی کا نمونہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

حیات جاودان، از سیدہ جمیلہ سلطانہ صاحبہ، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت تحریر نہین، پتہ:- نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ،

اس دور کے شعرا مین جناب شفیق جونپوری کا کلام جدید و قدیم رنگ کی آمیزش کا نہایت دلکش نمونہ ہے، اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ ہی لطافت و پاکیزگی، زبان کی صحت و صفائی، اصول فن کی پابندی مشق و ممارست کی پختگی ہر لحاظ سے نئے دور کے شعرا مین امتیازی حیثیت رکھتا ہے، مصنفہ نے اس کتابچہ مین ان کے مختصر حالات اور کلام کی مختلف اصناف پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور اسکے نمونے دیئے ہین،

"م"

جلد ۶۳ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۹ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات